



فہرست

ادب و مزاح

۱. انگش و نگش

بچوں کی دنیا

۳. انوکھی سزا

۴. آخری گولی

۶. شیر اور گیدڑ کا مقدمہ، بندر کا انصاف

۷. ہائے میرا بچپن!!!!

سچی کہانیاں

۹. حکیم صاحب

مشہور شخصیات

۱۱. اقبال اور فلسفہ خودی

معاشرہ اور ثقافت

۱۳. چینی کے بغیر چینی چائے کا لطف

۱۴. لاہور ایک قدیم شہر

۱۵. مدر ڈے

اس مختصر انگریزی میں بھی ایسی ایسی مشکلات آن پڑی ہیں کہ کئی دفعہ جملہ سمجھنے کے لیے استیضہ کرنا پڑتا ہے۔ ابھی کل مجھے ایک دوست کاشج آیا، لکھا تھا ”U r inv in bk crmy“ میں نے حیرت سے سبج کو پڑھا، اللہ جانتا ہے تین چار دفعہ مجھے شک گذرا کہ اس نے مجھے کوئی گندی سی گالی لکھی ہے، دل مطمئن نہ ہوا تو ایسی ہی انقش کھینے اور سمجھنے کے ماہر ایک اور دوست سے رابطہ کیا، اس مرد مجاہد نے ایک سیکنڈ میں ٹرانسلیشن کر دی کہ لکھا ہے You are invited in book's ceremony!!!

انگریزی کے بدلے ہوئے رنگ صرف میں تک محدود نہیں، اب تو کوئی صحیح انعکاس بھی جملہ کچھ جائے تو اس کی ذہنی حالت پر چک ہونے لگتا ہے، مادر ہونے کے لیے انگریزی کا بیڑا غرق کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے، میں تو کہتا ہوں انگریزی کی صرف مانگ ہی نہیں، دلت بھی توڑ دینے چاہئیں، اس بددلت نے ساری زندگی ہمیں خون کے آنسو دلایا ہے۔ سزاہ ترین اطلاعات کے مطابق اب انگریزی کھسنے کے لیے گرامر اور Tenses بھی غیر ضروری ہو گئے ہیں۔ یعنی اگر کسی کو کہنا ہو کہ ”میں تمہارا منتظر ہوں، تم اب تک آؤ گے؟“ تو بڑی آسانی سے اسے پچھلیوں میں یوں کھسا جاسکتا ہے m wtg u cm whn!!!!

مصنف: یوسف

آج سے کچھ سال پہلے تک مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میں فارسی، عربی، پشتو اور اُردو کی زبان تو سیکھ سکتا ہوں لیکن انگریزی نہیں، لیکن اب جو حالات چل رہے ہیں ان کو مد نظر رکھ کر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یا تو مجھے انگریزی آگئی ہے، یا سب کو بوجھل گئی ہے۔ کچھ بھی ہو، میری خوشی کی انتہا نہیں، اب سارے سپینک بدل گئے ہیں اور دو تین لفظوں میں ساگئے ہیں۔ اب Coming لکھتا ہو تو صرف cmg سے کام چل جاتا ہے۔ گرل فرینڈ GF ہوگئی ہے اور فیس بن FB بن گئی ہے۔ اب کوئی انگریزی کا لبا لفظ لکھتا ہو تو اس سے پہلے کے چند الفاظ لکھ کر ہی ساری بات کہی جاسکتی ہے، میں نے سارے تین سال کی ”نمایشِ مہفوت“ کے بعد unfortunately کے سپینک یاد کیے تھے، آج کل صرف Unfort سے کام چل جاتا ہے یعنی جہاں سے مشکل سپینک شروع وہیں پہ ختم۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن اب تو

”شارٹ پیئر“ کی وہ قسم ہے جو کسی کالج یا انسٹی ٹیوٹ میں نہیں پڑھائی جاتی۔ اس زبان میں خوبیاں تو بہت ہیں لیکن ایک کی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی، یہ جذبات سے عاری زبان ہے، یہ چند لفظوں میں دو ٹوک بات کرنے کی عادی ہے، اس زبان میں کسی کی موت پر sad v لکھ دینا ہی کافی سمجھا جاتا ہے، یہ محبتوں اور احساسات سے محروم زبان ہے۔ میں یہ زبان کچھ کچھ سیکھ چکا ہوں، لیکن استعمال کرنے سے گھبراتا ہوں، پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے اگر میں نے بھی یہ زبان شروع کر دی تو مجھ میں اور رپوٹ میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔

§§§

انوکھی سزا

مصنف: یوسف

”حسن بیٹا، دوکان سے ایک کلو چینی جلدی سے لے آؤ“ حسن کی امی نے حسن کو دیکھ کر بلند آواز سے کہہ دیا۔ حسن اس وقت کھیل کر گھر میں داخل ہو رہا تھا۔



”جی امی! ابھی جاتا ہوں“ حسن نے جواب دیا، اور گھر سے کچھ ہی دور موجود دوکان کی طرف چل پڑا، دوکان پر پہنچ کر حسن نے ایک کلو چینی کا آرڈر دیا۔

دوکاندار حسن کی بات سن کر مڑا اور دوکان کے اندرونی حصے کی طرف چینی لینے کے لئے چلا گیا، اسی دوران حسن کی نگاہ دوکان میں سامنے ریگ پر رکھے ایک ڈبہ پر پڑی جو رنگ برنگے کیلوں سے بھرا پڑا تھا، حسن اس وقت بھوکا تھا، اسکے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا اس نے دوکاندار کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر جلدی سے ایک کیک اٹھایا اور منہ میں ڈال کر ٹھکے کی کوشش کرنے لگا، اسی دوران دوکاندار واپس آگیا، اور حسن کو چینی دی، حسن نے چینی لے کر رقم لوٹی، اور گھر کی طرف چل پڑا۔

حسن دل ہی دل میں بہت خوش تھا کہ دوکاندار اسکی چوری کو نہیں دیکھ سکا، اور کیک مفت میں اس نے کھا لیا، کیک کا ذائقہ حسن کو بہت اچھا لگا، لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جب سے اس نے کیک کھایا ہے اسکے گلے میں کوئی چیز پھنس سی گئی ہے۔

حسن گھر پہنچا، ماں کو چینی تھمائی اور ایک کمرے میں موجود آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا، حسن نے اپنا منہ کھولا اور آئینے کی مدد سے گلے میں جھانکنے لگا، کہ وہ کون سی چیز ہے جو اس کے گلے میں پھنس گئی ہے، اور اب تو درد بھی ہونے لگا تھا۔ حسن زور لگا کر پورا منہ کھولنے کی ناکام کوشش کرتا رہا، مگر اسے کوئی چیز نظر نہیں آئی۔

ابھی حسن آئینے کے سامنے کھڑے منہ کھولے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک حسن کی امی کمرے میں داخل ہوئیں اور حسن کو یوں منہ کھولے آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ کر حیران ہوئیں، اور پوچھا، حسن بیٹا اس طرح منہ کھولے آئینے کے سامنے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔

حسن اپنی امی کو سامنے دیکھ کر گھبرا گیا، اور بولا، نہیں امی، بس دیے ہی کھڑا ہوں۔

ابھی حسن نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے گلے میں ایسا شدید درد ہوا جیسے اسکے گلے کو کسی نے تیز دھار آلے سے کاٹ دیا ہو، حسن وہیں زمین پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔

حسن کی امی یہ دیکھ کر گھبرا گئیں کہ اچانک میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟ حسن کی امی نے جلدی سے حسن کو سیدھا کر کے بستر پر لٹایا اور پوچھا کہ کیا ہوا ہے بیٹا؟

حسن مسلسل چیخے، چلائے جا رہا تھا، اس کے گلے سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں، اسکے منہ سے ہلکا سا خون بھی باہر نکل رہا تھا۔ اب حسن کو یقین ہو گیا تھا کہ اسکے گلے میں کوئی چیز موجود ہے جسکی وجہ سے اسکی یہ حالت ہو گئی ہے۔ حسن کی امی یہ سب دیکھ کر ہلٹا گئیں اور زور زور سے سب گھر والوں کو آوازیں دینے لگیں، حسن کے ابو، دوا، دلاوی، بہن، بھائی سب دوڑے چلے آئے، اور حسن کی حالت دیکھ کر سب گھبرا گئے۔

حسن کے دوا نے جلدی سے پانی منگوا دیا اور حسن کو بہت سا پانی پلایا لیکن کچھ افادہ نہ ہوا۔ حسن کا درد اور محسوس دینی ہی رہیں، اس کی حالت غیر ہو رہی تھی، وہ دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا، جب اس نے چوری کیے وہ کیک کھایا تھا۔

حسن کی دواوی ماں نے ایک روٹی کا ٹکڑا منگوا دیا اور حسن کے منہ میں ڈال دیا، حسن نے اس روٹی کے ٹکڑے کو باہر اگل دیا، اس سے کچھ نہیں کھایا جا رہا تھا۔

تب حسن کے ابو نے سختی سے پوچھا کہ حسن سچ سچ بتاؤ کیا کھایا تھا جس کی وجہ سے یہ حالت ہو رہی ہے، حسن نے جب یہ دیکھا کہ اب بتانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، تو اس نے روتے ہوئے شرمندہ لہجے میں سب کو بتا دیا کہ اس نے دوکاندار کی نظروں سے بچ کر ایک کیک کھایا تھا تب سے اس کے گلے میں کوئی چیز پھنس گئی ہے۔

حسن کے ابو نے ایک خشک روٹی کا بڑا سا ٹکڑا منگوا دیا اور حسن کو اسکے ٹھکے کا حکم دیا، حسن نے بہت اٹکار کیا، مگر اس کی ایک نہ چلی، مجبوراً اس نے وہ ٹکڑا منہ میں رکھا اور اسے ٹھکے کی کوشش کرنے لگا، حسن کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، وہ برے برے منہ بنا رہا تھا، اور دل میں اپنے آپ پر لعن طعن کر رہا تھا کہ کاش وہ کیک کھانے کی غلطی نہ کرتا۔



حسن مسلسل اس خشک روٹی کے ٹکڑے کو ٹھکے کی کوشش کر رہا تھا، کہ اچانک اسے زوردار اٹکائی آئی اور

مسلسل سے شروع ہو گئیں، جیسے ہی حقہ رکی، حسن کو گلے میں کچھ سکون محسوس ہوا، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب اسکے گلے میں کوئی چیز نہیں ہے، اب اسے درد بہت کم محسوس ہو رہا تھا۔ حسن کے ابو اب اس حقے کو دیکھ رہے تھے کہ آخر کیا چیز حسن کے گلے میں پھنس بن کر اسے تکلیف دے رہی تھی۔ اچانک حسن کے ابو کو کسی کالی سی چیز کے ٹکڑے نظر آئے، غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ بیٹے کا پچھلا حصہ ہے اور یہی بیٹونا حسن کے گلے میں پھنس گیا تھا، اسی کے کاٹنے کی وجہ سے حسن کی حالت غیر ہو گئی تھی، بیٹے دیکھ کر اب سب کو یہ بات سمجھ آگئی تھی کہ جب حسن نے جلدی سے کیک اٹھا کر منہ میں ڈالا تھا، تو اس وقت وہ بیٹونا اس کیک پر بیٹھا تھا، وہ بھی کیک کے ساتھ حسن کے منہ میں چلا گیا، لیکن پیٹ میں جانے کی بجائے حلق میں پھنس کر رہ گیا، اور باہر ٹھکے کی مسلسل کوشش کرنے کی وجہ سے حسن کو یہ سب کچھ جھیلنا پڑا۔ حسن کو اس کے بچے کی سزا مل چکی تھی۔ وہ سب گھر والوں کے سامنے بلام کھرا تھا۔ حسن کے ابو نے حسن کو گلے سے لگا لیا اور معاف کر دیا۔ اور وعدہ لیا کہ آئندہ حسن کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

اسکے دن جب حسن کی حالت کچھ سنبھل گئی تو حسن کی امی نے حسن کو پانچ روپے دیے اور کہا کہ جاؤ بیٹا یہ پیسے دوکاندار کو دے آؤ۔ یہ اس کیک کے پیسے ہیں جو تم نے کل کھایا تھا، حسن اسی دوکان پر چلا گیا اور دوکاندار سے کہا کہ معذرت اٹھ، کل آپکی دوکان سے میں نے غلطی سے کیک کھایا تھا اور پھر حسن نے جیب سے پیسے نکالے اور دوکاندار کی طرف بڑھا دیے۔ دوکاندار حسن کی اس ایمانداری کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور سامنے پڑے ہوئے اسی کل والے کیک کی طرح ایک اور کیک نکال کر حسن کی طرف بڑھا دیا اور کہہ دیا کہ لے لو بیٹا یہ میری طرف سے اس ایمانداری کا انعام سمجھ کر کھا لو، حسن نے جیسے ہی کیک دیکھا اسے کل خود کے ساتھ جتا مارتا یاد آگیا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسکے گلے میں پھر سے کوئی چیز پھنس گئی ہو حسن فوراً گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ دوکاندار حسن کو یوں بھانکتا دیکھ کر حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ کتنا پیارا اور نیک بچہ ہے، ایسا بچہ آجکل کہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اب اسے کیا معلوم کہ حسن کے ساتھ یہ کیک کھانے کی وجہ سے کیا بیٹن۔ حسن نے گھر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ آئندہ وہ کبھی چوری نہیں کرے گا اور نہ ہی کبھی کیک کھائے گا۔ یوں حسن کی پہلی غلطی اس کی آخری غلطی بن گئی۔

آخری گولی

مصنف: یوسف

وہ کل پانچ افرو تھے، تین مرد اور دو عورتیں۔ شام کے وقت ساحل سمندر کے ایک ویران گوشے میں، پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے دائیں طرف سمندر کی منہ زور لہریں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں اور بائیں طرف ایک اونچی چٹان سر اٹھائے کھڑی تھی، جو کسی پہاڑی کا باقی ماندہ حصہ تھی۔ چند قدم دور چار پانچ گاڑیاں کھڑی تھیں اس گروپ کے چیف کا نام تھا شفقت اگرچہ شفقت نام کی کوئی چیز اس کے چہرے پر دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ ایک ہٹا کٹا شخص تھا، چٹان کی طرح مضبوط اور پتھر کی طرح پتھریلا۔ چیف نے اپنا تک پہلو ہلا اور بولا :

"خواتین و حضرات آپ سب ملک کی خفیہ تنظیم کے ارکان ہیں۔ آپ کی مناسب کارکردگی کو مد نظر رکھ کر آپ کو ایک خفیہ مشن سونپا گیا۔ آپ میری ہدایات کے مطابق اپنا کام احسن طریقے سے سر انجام دیتے رہے مگر پھر ہم میں سے کسی نے ایک "کارنامہ" بھی سر انجام دے دیا، خفیہ سی ڈی کے چند منتخب حصے دشمن کے ہاتھوں فروخت کر دیے گئے۔"

چیف پھر اپنا تک خاموش ہو گیا وہ گرم نظروں سے ایک ایک کا چہرہ پڑھ رہا تھا، ہر ایک کو بری طرح گھور رہا تھا، بات ہی ایسی تھی، ملک سے غداری اور تنظیم سے بے وفائی۔ چیف نے سرد ہوا سے ہتھکڑی کے لیے عمدہ اونٹنی مفلر لے رکھا تھا۔ اس نے اپنا چڑی تھیلا کھول کر اس میں سے ایک سیاہ بڑا پتھول نکالا۔ اس ماحول میں اس کی کرخت آواز پھر گونجی:

"غداری کی سزا موت ہوتی ہے، آپ سب جانتے ہیں کہ خفیہ ادارے غدار کو موت کے گھاٹ اتار کر دوسرے برے افرو کے لیے عبرت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ کیا کسی کو اس بات پر اعتراض تو نہیں کہ غدار کو مارا نہ جائے؟"

"نو چیف" چند ملی بجلی آوازوں نے سر جھکا دیا۔

"اگلو تو گویا آپ سب اس تنظیم کے اچھے کارکن ہیں۔" چیف نے اپنی جیب میں سے تین گولیاں نکال کر پتھول کو کھولا اور اس کے جیبیر میں وہ گولیاں ڈال دیں۔ پھر پتھول کی نال ہوا میں بلند کی اور ٹریگر دبا دیا۔ چیف نے دو گولیاں فضا میں چلا کر ضائع کر دیں۔ اب آخری گولی باقی تھی۔

"غدار کی قسمت کا فیصلہ اب یہ آخری گولی کرے گی۔" چیف نے زبان کھولی تو سب کے چہروں پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ غدار کی نامزدگی کے بغیر ہر ایک شخص اپنے آپ کو مجرم اور غدار سمجھ رہا تھا کہ کہیں غدار کی اس پر کوئی الزام تو نہیں لگ گیا۔

چیف نے پتھول دوبارہ کھول کر اس کا جیبیر گھما دیا

اور پھر اپنا تک پتھول بند کر دیا۔ اس نے سب کو ترچھی نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ "معزز خواتین و حضرات آپ سب شریف، ایمان دار اور پادشا افرو ہیں۔ آپ ملک کی اس خفیہ تنظیم کے ساتھ بھی مجلس ہیں۔ میں کسی بھی فرد پر غداری کا الزام لگا کر اس پر کیچڑ اچھانا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ یہ بات بہت بڑا "کارنامہ" ہے کہ کسی پر بہتان باندھا جائے، لہذا میں اس آخری گولی کا ہی فیصلہ تسلیم کروں گا دیکھئے، یہ گولی کیا فیصلہ کرتی ہے۔ میں اس عمل کا آغاز خود سے کرتا ہوں۔ میری آپ سب کے لیے دلی دعا ہے کہ آخری گولی صرف غدار کا ہی کام تمام کرے۔ مجھے اس طریقے پر بھروسہ ہے۔ میں چند سال قبل بھی آخری گولی کی مدد سے غدار کو سزا دے چکا ہوں بلکہ قسمت غدار کو خود ہی ڈھونڈ لیتی ہے۔"

چیف نے پتھول کی نالی اپنی کینٹی پر رکھی، آنکھیں بند کیں اور پتھول کی لہلی دبا دی

"ٹھٹھ۔"

اس نے آنکھیں کھول کر خدا کا شکر ادا کیا اور پتھول شد صاحب کے حوالے کیا۔ شد صاحب نے گہرا سانس لیا اور پتھول کی نالی اپنے سر پر رکھ کر پتھول چلا دیا

"ٹھٹھ۔"

شد صاحب جی کر مراٹھے تھے۔ انہوں نے تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پتھول عبدالقیوم صاحب کے حوالے کر دیا۔ عبدالقیوم صاحب چار بچوں کے باپ تھے انہوں نے زیر لب خدا سے دعا کی۔ ساری دنیا ان کے سامنے پلے بھر میں سمت آئی۔ وہ غدار تو نہیں تھے مگر اس آخری گولی کا بھلا کیا بھروسہ۔ انہوں نے خالق کائنات کو پکار کر پتھول کی نالی اپنے ہاتھ پر رکھی اور اس کی لہلی دبا دی۔

"ٹھٹھ۔"

وہ فٹ گئے تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں شکرانے کے نفل ادا کرنے کا تہیہ کر لیا۔

پتھول اب شمس کے ہاتھ میں تھا۔ شمس تخت گیر عورت دکھائی پڑتی تھی۔ عمر چالیس سال، تین بیٹوں کی ماں اور ایک بوڑھی بیمار ماں کی واحد خبر گیر۔ اس نے پتھول تمام کر قدرے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا: "چیف میں غدار نہیں ہوں، آپ میرا ریکارڈ چیک کر لیں اور کوئی ثبوت مل جائے تو مجھے اتنا لٹکا کر میری چڑی اتار دیں، پھر مجھے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیں۔"

"نہیں، آپ تو بہت اچھی ہیں۔" چیف نے مٹر کیا۔

"تو پھر؟"

"پھر فیصلہ آخری گولی کا ہو گا، جو اس پتھول کے جیبیر میں گھوم رہی ہے۔"

"چیف میرے تین چھوٹے چھوٹے بیٹے ہیں جو رات کے کھانے پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے اور میری بوڑھی

ماں میرا حد درجہ شریف خاوند۔"

"اودہ آپ مجھے رالانے والی باتیں نہ کریں۔" چیف کی آواز بھی رندہ گئی۔ وہ اگرچہ اداکاری کر رہا تھا مگر کامیاب اداکاری کر رہا تھا۔

چیف کے بے لچک رویے اور بے لحاظ نظروں نے شمس کو بتا دیا کہ اس کا فیصلہ اٹل ہے۔ تب اس نے لرزتے ہاتھ سے پتھول بلند کیا۔ پتھول کی نالی اپنے سر پر رکھ لی اور کلمہ توحید کا ورد کرتے ہوئے لہلی دبا دی۔

آواز صرف "ٹھٹھ" کی ابھری

چیف نے اسے نئی زندگی کی مبارک باد دی، جو اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کی۔

پتھول اب مس کرن کے پاس تھا۔ کرن تیس سالہ لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر حد درجہ معصومیت کا غلبہ تھا۔ چیف نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ آخری گولی اس پتھول میں جہاں کہیں بھی تھی، گھوم گھام کر پتھول کے نالی کے عین سامنے یا بالکل قریب آچکی تھی۔ پتھول چار بار چلایا جا چکا تھا اور اب خطرہ نوے فیصد سے بھی بڑھ چکا تھا، آریا یاد والا معاملہ تھا۔

"گولی چلائیں مس کرن" چیف نے اسے حکم دیا۔

تب پتھول کرن کی گود میں پڑا تھا۔ اس نے شش و پنج میں مبتلا ہو کر پتھول تمام لیا۔ اس نے ذرا ٹھہر کر کہا: "اندھی گولی کا فیصلہ اندھا ہوگا، میں نے کیا کیا ہے چیف کہ مجھے بھری جوانی میں موت کی گھاٹی میں دھکیلا جا رہا ہے۔"

چیف نے سخت لہجہ اختیار کیا: "اس پتھول میں چھ گولیوں کی جگہ ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ آخری گولی اب نالی کے سامنے پہنچ جاتی ہو۔ معاملہ اگرچہ بہت خطرناک تھا مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے بعد میں پتھول کو اپنی کینٹی پر رکھ کر چلائوں گا اگر ایسا وقت یا تو" چیف نے ان سب کو دیکھ کر کہا۔ "میں خود کو سب سے پہلے سزاوار سمجھتا ہوں، اس لیے اس عمل کا آغاز میں نے خود سے کیا تھا اور انجام بھی وقت پڑنے پر خود ہی پر کروں گا مس کرن بے دھڑک گولی چلائیں اگر یہ غدار وطن نہ ہوئیں تو ان کی زندگی خواب نہیں ہو گی۔"

خوف زدہ کرن خاموش بیٹھی رہی۔

"مس کرن گولی چلائیں، اپنے چیف کا حکم ماننا بھی جرم ہے۔" پھر کرن نے اپنا تک ہاتھ سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ فضا دھماکے سے گونج اٹھی تھی۔ چٹان پر بیٹھے ہوئے آبی پرندے اور سمندری بگلے اڑ گئے تھے۔ چیف فٹج کر پتھر پر سے نیچے گرا تھا اور اس نے اپنا سینہ اپنے دونوں ہاتھوں سے تمام رکھا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے ربت پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ کرن ماہر نشانہ انداز تھی وہ کئی بار نشانہ اندازی کے مقابلوں میں انعام حاصل کر چکی تھی۔ اس نے اپنے فن کا مظاہرہ چیف کے عین دل پر کیا تھا۔ چیف کا حکم نہیں ٹالا تھا۔ گولی تو چلائی تھی مگر اپنے سر پر نہیں، چیف کے سینے پر کرن نے وہ پتھول پھینک

کر اپنے لباس میں سے ایک مائوڈر نکال کر باقی ماندہ افراد پر تان لیا تھا تاکہ کوئی اسے روک نہ سکے۔ وہ اگلے قدموں پیچھے ہٹ رہی تھی تاکہ چند قدم دور جا کر اپنی گاڑی میں سوار ہو سکے۔ اس نے گھوم کر اپنی گاڑی کی طرف دیکھا اور یہی لمحہ قیامت بن گیا اچانک اسے کسی نے فضا میں گیند کی طرح اچھال دید۔ وہ منہ کے بل زمین پر گری تو مائوڈر بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کو شوا صاحب نے اپنے تھکنے میں قابو کر لیا۔ اس پر حیرت کا پہلا ٹوٹ پڑا کہ خاک میں غلط چیف پتھر پر پاؤں دھرے کھڑا تھا اور اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ چیف کے ہاتھ میں ایک چھوٹا پتول تھا جو اس نے بھینٹا اپنے اوئی مظلم میں سے نکالا تھا وہ آخری گولی سے بچ نکلا تھا۔

چیف نے کہا: "مجھے تجھ پر پہلے ہی یقین کی حد تک شک تھا۔ میری خفیہ اطلاع کے مطابق تو نے بیروں والے زیورات خریدے ہیں اور دنیا کے ایک مہنگے شہر میں بنگلہ بھی۔ کرن بی بی وہ آخری گولی، پٹانا گولی تھی۔ میں اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ غدار تلاش کرنے کے لیے اندھی گولی کی مدد لیتا۔ میں نے جب جیبر کو گھمایا تو بند کرتے وقت میں نے پتول کا جیبر اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کی مدد سے یوں روکا تھا کہ پٹانا گولی پانچویں خانے میں تھی۔ میں نے تم لوگوں پر نفیاتی حربہ استعمال کیا تھا اور یوں غدار لڑکی پکڑی گئی۔"

کرن جب تم مائوڈر تمام کر قدم قدم، اگلے پاؤں پیچھے ہٹ رہی تھی تو میری طرف تیرا دھیان نہیں تھا اور جب تم نے گاڑی کی طرف پلٹ کر مجھے ایک لمحہ دیا تو میں نے تجھے اٹھا کر فضا میں اچھال دیا، شاید تیرے علم میں نہ ہو کہ میں ایک ماہر نفسیات ہوں اور نجا ماسٹر بھی۔"

§§§

شیر اور گیدڑ کا مقدمہ، بندر کا

انصاف

مصنف: یوسف

بہت عرصے قبل ایک شیر اور گیدڑ میں گہری دوستی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو حیران کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ایک دن شیر نے ایک موٹی تازی بکری کو زندہ پکڑا اور اپنے دوست گیدڑ پر رعب بھانڈنے کے لیے جلدی جلدی اس کی بھٹ پر آیا لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں کیونکہ گیدڑ اس سے پہلے ہی ایک گائے کو پکڑے بیٹھا تھا۔ ”ایک گیدڑ شیر سے اچھا کھار کیسے کر سکتا تھا؟“ شیر نے غصے میں سوچا اور خاموشی سے بکری کو باہر گائے کے ساتھ باندھ کر سونے کے لیے چلا گیا کیونکہ رات کافی ہو چکی تھی لیکن وہ ساری رات جانتا رہا کیونکہ اسے حسد ہو رہا تھا کہ آخر گیدڑ نے گائے کو پکڑا کیسے۔ آخر کار اس سے رہا نہیں گیا تو سورج نکلنے سے پہلے ہی باہر نکل کر گائے کے پاس پہنچ گیا لیکن وہاں گائے کے ساتھ ایک چھڑا بھی کھڑا تھا جسے رات میں ہی گائے نے ختم دیا تھا۔ چھڑے کو دیکھتے ہی شیر کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس نے خود سے کہا ”میرے دوست کو دونوں کی ضرورت نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چھڑے کو بکری کے پاس لے گیا اور اسے اس کا دودھ پلانا شروع کر دیا اور صبح ہوتے ہی وہ چلا تا ہوا گیدڑ کے پاس گیا اور اس سے کہا ”جلدی چلو میرے ساتھ.... میری بکری نے رات میں چھڑے کو ختم دیا ہے۔“ گیدڑ نے جب جا کر دیکھا تو چھڑا بکری کا دودھ پنی رہا تھا یہ دیکھ کر اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا: ”ناممکن“ ایک بکری کے یہاں گائے کا بچہ نہیں ہو سکتا۔ صرف گائے ہی چھڑے کو پیدا کر سکتی ہے۔ یہ چھڑا میرا ہے۔“

یہ بات سن کر شیر نے غراتے ہوئے کہا پاگل مت بنو۔ ثبوت تمہارا رے سامنے ہے۔ یہ دونوں ایک ساتھ کھڑے ہیں اور یہ چھڑا میرا ہے۔“ ”نہیں میں اس ثبوت کو نہیں مانتا۔“ گیدڑ نے غصے سے جواب دیا اور پھر دونوں آپس میں لڑنے لگ گئے۔ اچانک شیر نے کہا ”ہم دونوں کسی کو منصف بنا کر اس بات کا فیصلہ کر دیتے ہیں کہ یہ چھڑا کس کا ہے؟“ شیک ہے لیکن میں تین لوگوں سے فیصلہ لوں گا۔ گیدڑ نے جواب دیا۔ شیر اس پر راضی ہو گیا اور وہ دونوں تین عقل مند جانوروں کو تلاش کرنے لگے جو ان کا فیصلہ کر سکیں۔ چلتے چلتے وہ ہرنوں کے ریوڑ کے پاس پہنچے جو درخت کے پتے کھا رہے تھے۔ کیا تمہارا ریوڑ میں کوئی عقل مند ہے؟“ شیر نے ان

کے قریب جا کر کہل۔ اس کی بات سن کر ایک بوڑھی ہرنی آگے بڑھی اور کہا اپنے ریوڑ کے جھگڑوں کا فیصلہ میں کرتی ہوں، بولو کیا کام ہے؟ ہم ایک مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر دونوں نے کہا نی سناٹی شروع کر دی۔ اب ان کی کہانی سن کر ہرنی سوچ میں پڑ گئی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ بکری چھڑے کو پیدا نہیں کر سکتی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شیر بہت خطرناک جانور ہے۔ اسی لیے اس نے شیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات سچ ہے کہ ہماری جوانی میں بکری چھڑے کو جنم نہیں دے سکتی تھی اور یہ کام صرف گائے ہی کر سکتی تھی تاہم اب زمانہ بدل گیا ہے اور بکری چھڑے کو جنم دے سکتی ہے اور میرا فیصلہ یہی ہے کہ یہ چھڑا شیر کا ہے۔“



”کیا.... یہ نہیں ہو سکتا“ ہرنی کا فیصلہ سن کر گیدڑ نے غصے سے کہا۔ ”چلو اب دوسرے منصف کو ڈھونڈتے ہیں۔“ یہ کہہ کر دونوں نے دوسرے جانور کو ڈھونڈنا شروع کر دیا جو ان کو انصاف دلا سکے۔ چلتے چلتے وہ چٹانوں کی طرف پہنچ گئے، جہاں انہیں ایک گڑ بگڑ نظر آیا اور انہوں نے اسے سارا جرا سنا دیا۔ ان کی بات سن کر گڑ بگڑ نے شیر کی طرف دیکھا اسے یاد تھا کہ شیر اس کے بہت سارے دوستوں کو کھا چکا ہے، اس لیے اس نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا: ”سنو معمولی بکری ہی بکری کے بچے پیدا کر سکتی ہے لیکن غیر معمولی نسل کی بکری سب کچھ کر سکتی ہے اور یقیناً شیر کی بکری بہت غیر معمولی ہے اور اسی وجہ سے یہ چھڑا بھی شیر ہی کا ہے۔“ ”تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ گیدڑ نے غراتے ہوئے گڑ بگڑ کو جواب دیا اور شیر سے کہا ”چلو اب ہمیں تیسرے انصاف کیلئے منصف کو تلاش کرنا ہے۔“ چلتے چلتے وہ ایک چٹان کے قریب پہنچے جہاں ایک بوڑھا بندر لیٹا ہوا تھا۔



”معاف کیجئے گا“ شیر نے بندر کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا ”کیا آپ ہمارے جھگڑے کا منصفانہ فیصلہ کر سکتے ہیں؟“ یہ بات سن کر بندر نے باری باری دونوں کی بات سنی۔ ان کی بات ختم ہونے کے بعد بندر نے چٹان پر اوپر اوپر کچھ دیکھنا شروع کر دیا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ ”کیا تم کھانے کے لیے کچھ ڈھونڈ رہے ہو؟“ شیر نے دھڑکتے ہوئے کہا ”ہمیں جلدی فیصلہ سنا؟ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے اور میں گھر جا کر اپنے چھڑے کو کھانا چاہتا ہوں“ صبر کرو ابھی میں بہت مصروف ہوں“ بندر نے جواب دیتے ہوئے کہا اور پتھر اٹھا لیا۔ ”مصروف؟“ شیر نے غراتے ہوئے پوچھا ”کیا کر رہے ہو؟“ ”ساز بجا رہا ہوں میں ہمیشہ فیصلہ کرنے سے قبل تھوڑا سا

جانتے ہیں کہ پتھر سے موسیقی کی آواز نہیں نکل سکتی۔“ یہ بات سن کر بندر نے پتھر کو ایک طرف رکھا اور کہا ”اگر ایک بکری چھڑے کو پیدا کر سکتی ہے تو پتھر سے بھی موسیقی کی آواز آسکتی ہے اور تم نے سنا؟“ کتنی سریلی موسیقی ہے“ یہ سن کر شیر ساری بات کو سمجھ گیا اور اس نے غراتے ہوئے کہا ”ہاں یہ آواز تو بہت خوبصورت ہے“ اس کی بات سن کر ارد گرد جمع ہونے والے سارے جانور بندر کی عقل مندی اور جرات کے قائل ہو گئے اور انہوں نے چلاتے ہوئے کہا ”بندر اس جھگڑے کا فیصلہ کر چکا ہے کہ صرف گائے ہی چھڑے کو جنم دے سکتی ہے اور اس پر گیدڑ کا حق ہے۔“ اب تمام جانوروں نے شیر کو لعن طعن شروع کر دی کہ وہ اپنے دوست کو دھوکا دے رہا تھا۔ یہ ماجرا دیکھ کر شیر نے شرم سے سر جھکا لیا اور واپس جا کر گیدڑ کو گائے کا بچہ واپس کر دیا۔



ز بھاتا ہوں “ ” کیا؟“ شیر نے چلاتے ہوئے کہا ” تم ہمیں بیوقوف بنا رہے ہو ، تمہارے ہاتھ میں پتھر ہے اور سب

آشیانہ

آ رہی مگر اس وقت واقعی بہت بڑی چیزیں لگ رہی تھیں۔ ذرا آٹھ سالہ بچے کے ذہن سے سوچیں! اور صورت حال کچھ یوں تھی کہ ہم شیر کے مضافاتی علاقے میں رہتے تھے بارہ میل دور ! جہاں آج کل بڑے بڑے شاپنگ سنٹرز، دفاتر اور تعلیمی ادارے ہیں وہاں گھنا جنگل تھا ہوا کر تا تھا سڑک کے دونوں جانب! نز دیک ترین شاپنگ سینٹر صدر ہوا کر تا تھا جہاں صرف اسٹاف بس کے ذریعے جایا جا سکتا تھا جو مقررہ اوقات میں ہی چلا کرتی تھی۔ امی جان پہلی بس سے ہی ہمارا سلمان لائے روانہ ہو گئیں ۔

اس سلمان کو دیکھ کر جو کیفیت ہوئی وہ آج بھی یاد ہے۔ خوشی بھرا اضطراب! جیسے عید کا انتظار ہوتا ہے کہڑے اور جوتے سامنے رکھ کر! جب مطلوبہ چیز پڑ شروع ہوا تو کچھ یوں منظر نامہ تھا کہ تقریباً پچیس پچوں اور بچیوں میں سے ہم واحد تھے جو پینٹنگ کا سلمان لے کر آئے تھے باقی سب خالی ہاتھ سر جھکا کر کھڑے تھے۔ نیچر نے پوری کلاس کو نافرمان کا خطاب دیا اور ہمیں اپنی میز پر بلا کر ڈرائنگ سکھانے لگیں ۔ جس وقت وہ ہم پر تعریف کے ڈونگے بر ساری تھیں اسی وقت پر ہیل بھی کارڈیور سے گزریں ۔ نیچر نے انہیں بتایا تو وہ بھی ہماری کلاس کو ڈانٹنے لگیں۔ اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت ذرا بھی فخریہ احساس نہیں تھا۔ یوں تو اپنی تعریف ہر ایک کو پسند ہوتی ہے مگر اس طرح نمایاں ہونے میں انسان کتنا تنہا ہو جاتا ہے!!! کیا خیال ہے؟ شام کو اپنے پڑوسی ہم جماعت کے گھر کھیل رہے تھے۔ اس نے اپنی ای سے شکست کی کہ مجھے رنگ کیوں نہیں ملتا کہ دینے آپ نے.....! اور جب ہمارے سامنے ای اسکی بڑی بہن نے اس کے کان ابھٹے یہ کہہ کر ” تم خود کھتے خراب لڑ کے ہو! تمہیں کچھ آتا بھی ہے! اس کو دیکھو کتنی اچھی بنی ہے“ یقین کریں میرا دل چاہ رہا تھا میں اپنے رنگ اسے دے دوں ! اب اس وقت کے درست جذبات تو ذہن میں نہیں ہیں مگر اب سوچتے ہیں کیا حقیقی تعریف کی حقدار میری ای نہیں تھیں جنہوں نے مجھے مطلوبہ چیزیں اہمیت کے ساتھ مہیا کیں؟؟آج ہم اس بات کا اظہار کر رہے ہیں مگر اس وقت تو یقیناً امی کا شکریہ ادا نہیں کیا ہو گا!

اس واقعے کا ذرا پ سین یہ ہوا کہ ہمارے چھوٹے بھائی نے جو ابھی اسکول نہیں جاتے تھے ایک دن موقع پا کر تمام رنگ خراب کر دیے ۔

اسکول سے واپسی پر جب ہم نے دیکھا تو جو ردنا شروع کیا وہ کئی دنوں بعد ہی ختم ہو سکا۔ یہ انسانی فطرت ہے جب کوئی نعمت ملتی ہے تو اپنے آپ کو اس کا حق دار سمجھتا ہے اور جب چھین جانے تو واویلا کرتا ہے ۔

بچپن کی یادوں میں ایک اہم واقعے میں بھٹو کا شکریہ! یہ کیا بات ہوئی ہے تو انسان کو تکلیف دینے والا شش پایہ ہے جو احسان کا جواب بھی ذنک مار کر دیتا ہے اس کا شکریہ کیوں؟؟

لطیفہ بننا اس وقت تو دلچسپ لگ رہا ہے مگر ائیں عمر میں تو رو کر برا حال ہوتا جب بھی ہنس ہنس کر یہ واقعہ سنا یا جاتا۔ جہاں تک شوق کا معاملہ ہے ہر بچے کی طرح ہمیں بھی کہاں سنابہت پسند تھا۔ دلی جان سال کا آدھا حصہ ہمارے گھر اور بقیہ آدھا بڑے ابا کے گھر حیدرآباد میں گزارتی تھیں۔ بچوں اور بوڑھوں کی دوستی تو دیسے بھی ضرب المثل ہے کیونکہ ان دونوں اقوام کو ہی اصول و قواعد کے کڑے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے ہیں اور جو ’لوگ کیا کہیں گے !‘ کے بھانے’ جہاں اور جیسا ہے‘ کی پالیسی پر یقین رکھتی ہیں۔ لہذا ہم بھی اپنی دلی جان کا انتظار ان کے جالتے ہی شروع کر دیتے تھے۔ اہم ترین وجہ ان کی کہانیاں ہوتیں جو ہم رات کو ان کے بستر کے گرد بیٹھ کر سنا کرتے تھے۔ چونکہ بچنے اور خصوصاً کہانیاں پڑھنے کے بہت شوقین تھے ۔ اسلئے موسم اور حالات کی پرواہ کئے بغیر دیواروں پر لکھے اشتہارات تک بڑے غور سے پڑھتے۔ اس پیکر میں بعض انہونی نہ ہو سکی کہ کئی دفعہ ہم بازار میں پھرنے سے بچے۔

نیک پریوں کی کہانیاں بے دریغ پڑھنے سننے کا نتیجہ تھا کہ ہم عام زندگی میں بھی کہا نیوں کی ٹیکنک استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یعنی یہ دیکھ کر کہ برادران امی کو سنا رہے ہیں۔ کبھی بات نہ مان کر تو کبھی شرارتوں میں! محلے والوں کی شکایتیں سن کر امی بے چاری پریشان ہو رہی ہیں۔ اس معاملے میں ہمارے نہ کوئی اختیارات تھے نہ حقوق! نہ وسائل نہ طاقت ! ہاں مگر ایک ہتھیار تھا! قلم کی قوت ! کسی پری کی طرف سے اپنے اس بھائی کے نام خط لکھتے جس نے کوئی نامعلوم حرکت کی ہو۔ مدعا یہ ہوتا کہ تم نے فلاں فلاں غلط حرکت کی ہے لہذا تمہیں میری طرف سے انعام نہیں ملے گا۔..... اب آپ خود سوچیں ایک بری سی میٹر ڈرائنگ میں پچکانہ اسٹائل میں کی گئی بات کتنے مزاح کا باعث بنتی ہوگی ؟ اس وقت آپ سے یہ شیر کرنا اتنا برا نہیں لگ رہا مگر اس وقت بڑی شرمندگی لگتی تھی حالانکہ یہ تذکرہ ہماری تعریف میں ہی ہوتا تھا۔ پڑیہ قلم اصلاح معاشرہ کے جراثیم ہمارے اندر گویا شروع سے ہی تھے۔ ہاں شعوری طور پر جب اس کا آغاز کیا تو ظاہر ہے اس کی بنیاد کوئی مہر بان ، نیک پری نہیں بلکہ رضائے امی ہوگئی۔

بچپن کا ایک واقعہ جو یاد آتا ہے اس وقت کا ہے جب ہم جماعت سوم میں پڑھتے تھے ۔ ہماری آرٹ ٹیچر نے اعلان کیا کہ آئندہ وہ ہمیں واٹر کولر سکھائیں گی ۔ ہر بچے کی طرح ہمیں بھی ڈرائنگ سے براشیف تھا۔ لہذا گھر پہنچتے ہی امی کو یہ خوشی بھری اطلاع دی اور ساتھ ہی وہ فہرست بھی پکڑائی جو مس نے منگوائی تھی۔ پیٹ برش اور رنگ کے علاوہ رنگ گولے کے لئے پلاسٹک کے پیالے ، اسپرن اور فائنو کہڑے وغیرہ آج تو اس میں سے کوئی بھی چیز پہنچنے سے باہر نظر نہیں

ہائے میرا بچپن!!!!

مصنف: یوسف

بچپن کا حساب کچھ یوں ہے کہ جوں جوں انسان بچپن کی طرف بڑھتا جاتا ہے بچپن زیادہ یاد آنا شروع ہوجاتا ہے ۔ یوں تو ایک خاص دور کے بچوں کا بچپن تقریباً یکساں ہی ہوتا ہے مگر چونکہ ہر فرد منفرد ہے تو ہر ایک کی علیحدہ کہانی ہوگی۔ آج سے تین چار عشرے قبل کے بچے معصوم ہوا کرتے تھے مگر ہم کچھ زیادہ ہی تھے یا پھر شریر بھائیوں کی موجودگی کی وجہ سے بنا دیے گئے تھے۔



ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جو کچھ یوں ہے کہ اس وقت ہماری عمر سات آٹھ سال ہوگی۔ جب ایک دن صبح دلی جان نے ہمیں چوٹی (آج کے بچوں کو کیا معلوم؟ ان کے لئے عرض ہے کہ چوٹی ایک روپے کا چوتھائی یعنی چار آنے ہوتے تھے۔ آج کے دس روپوں کے ہم پلہ سمجھ لیں) امی کے سامنے والے کھوکھے سے انڈے لے آئے۔ ہماری ہاتھیں کل اٹھیں اور اپنے پچھلے دن کے ہارے میں سوچنے لگے کہ دلی کی اس خاص مہربانی ہماری کس بات کا انعام ہے! جلدی سے sweet egg ذہ (یہ ہمارے بچپن کی خاص چیز تھی ۔ میٹھی باریک انڈوں کی شکل کی گولیاں جو ایک موہائیل کے سائز کے ڈبے میں ہوتی تھیں۔ اس ڈبے پر پھتری تلے مرغی کی تصویر ہوتی تھی ہائے پر مٹھے انڈے جھٹیلی پر کرتے تو بس..... کیا مصیبت ہے ! بچپن کا حال لکھیں تو ہر چیز explain کر کے بتائیں کہ آج وہ چیزیں ہی ناپید ہو گئیں) بھاگ کر لائے اور لان میں ہی بیٹھ کر کھانے لگے ایسا نہ ہو کہ برادران میں سے کوئی آپک لے اور خواہ مخواہ بٹوارا کرنا پڑے! بڑوں کی دھونس تو چھوٹوں کی ضد دونوں ہی خطرناک تھے اس معاملے میں ! ذہ ختم کر کے جب اندر آئے تو دلی نے ہمارے خالی ہاتھ کو دیکھا اور انڈوں کا پوچھا تو صورت حال واضح ہوئی کہ وہ بیپاری آلیٹ کے لئے پیاز کاٹ کر منتظر تھیں کہ ہمارے آنے پر ناشتے کا انتظام ہو! جی نہیں ! ڈانٹ نہ پٹائی کچھ بھی نہ ہوا ہاں مگر اپنا

قصہ کچھ یوں ہے کہ ہم سارے بچے اسکول بس کے ذریعے اپنے اسکول جا یا کرتے تھے۔ یہ رواج تو آج بھی ہے کہ بچے شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس زمانے میں دور دراز جانے کی وجہ اسکولوں کا گھروں سے فاصلے پر ہونا ہوتا تھا اسٹینڈرڈ ہر گز نہیں تھے۔

تو جناب! ہماری ایک بس کی ساتھی نے ایک دن ہمیں بتا یا کہ ان کے اسکول میں اردو پاکستانی فلم دکھائی جائے گی۔ اس زمانے کے بچوں اور نوجوان نسل کے لئے سینما جاکر فلم دیکھنا بہت بڑی تفریح ہوا کرتی تھی اسج کی طرح نہیں کہ فلم just a click پر ہو! بہت سے خاندانوں میں یہ شجر ممنوعہ ہوا کرتی تھی۔ شیطان اس وقت بھی اپنے تمام حربوں کے ساتھ میدان میں ہوتا تھا لہذا مختلف تعلیمی اداروں میں اس کو دکھانے کا اہتمام کیا جاتا کہ کوئی محروم نہ رہے۔ ساتھی کی اس خبر پر ہمارا بھی بہت دل لپکا یا اور نہ جانے کس طرح امی سے اجازت اور نکٹ کے پیچھے لئے یہ غیر ضروری بات ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ اس دن ہم اپنی دوست کے اسکول میں فلم دیکھنے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جوتا پہنتے ہوئے بری طرح تکلیف ہونے لگی جب ہمارا جوتا اتر دیا گیا تو وہاں بچھو صاحب آرام فرما رہے تھے اور ہمارے انگوٹھے پر ڈنک مار مار کر ہمارا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ آگے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں! ہمیں فوری طور پر ٹریڈنٹ دی گئی۔ تکلیف اور فلم نہ دیکھنے کا افسوس ساتھ ساتھ رہے۔ یہ واقعہ پڑھ کر آپ کو یقین آگیا ہوگا کہ ہم نے اس کا شکریہ درست ادا کیا تھا کہ اس نے ہمیں ڈنک مار کر فلم دیکھنے سے بچا کر نہ صرف ہماری معصومیت کو دفاعار ہونے سے بچایا بلکہ سنت کے مطابق چیزوں کو چھپا کر استعمال کرنے کی عادت ڈلوائی

میرا خیال ہے کہ بچپن نمبر کے لئے اتنے ہی واقعات بہت ہیں! ہمارا بچپن ہمارے دور کی جھلک ہے! کیسا لگا یہ دور؟؟

§§§

حکیم صاحب

مصنف: یوسف

پنجاب کے شہر گجراتولا میں ایک حکیم صاحب ہوا کرتے تھے، جن کا مطب ایک پرانی سی عمارت میں ہوتا تھا۔ حکیم صاحب روزانہ صبح مطب جانے سے قبل بیوی کو کہتے کہ جو کچھ آج کے دن کے لیے تم کو درکار ہے ایک چنٹ پر لکھ کر دے دو۔ بیوی لکھ کر دے دیتے۔ آپ دکان پر آ کر سب سے پہلے وہ چنٹ کھولتے۔ بیوی نے جو چیزیں لکھی ہوتیں۔ ان کے سامنے ان چیزوں کی قیمت درج کرتے، پھر ان کا ٹوٹل کرتے۔ پھر اللہ سے دعا کرتے کہ یا اللہ! میں صرف تیرے ہی حکم کی تعمیل میں تیری عبادت چھوڑ کر یہاں دنیا داری کے پکڑوں میں آ بیٹھا ہوں۔ جو ہی تو میری آج کی مطلوبہ رقم کا بندوبست کر دے گا۔ میں اسی وقت یہاں سے اٹھ جاؤں گا اور پھر سببی ہو۔ کبھی صبح کے ساڑھے نو، کبھی دس بجے حکیم صاحب مریضوں سے فارغ ہو کر واپس اپنے گاؤں چلے جاتے۔

ایک دن حکیم صاحب نے دکان کھولی۔ رقم کا حساب لگانے کے لیے چنٹ کھولی تو وہ چنٹ کو دیکھتے دیکھتے ہی رہ گئے۔ ایک مرتبہ تو ان کا دماغ گھوم گیا۔ ان کو اپنی آنکھوں کے سامنے تارے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے لیکن جلد ہی انہوں نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا۔ آٹے والے وغیرہ کے بعد بیگم نے کھانا کھا، بیٹی کے جینز کا سامان۔ کچھ دیر سوچتے رہے پھر۔۔۔ چیزوں کی قیمت لکھنے کے بعد جینز کے سامنے لکھا ”یہ اللہ کا کام ہے اللہ جانے۔“

ایک دو مریض آئے ہوئے تھے۔ ان کو حکیم صاحب دوائی دے رہے تھے۔ اسی دوران ایک بڑی سی کار ان کے مطب کے سامنے آ کر رکی۔ حکیم صاحب نے کار یا صاحب کار کو کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ کئی کاروں والے ان کے پاس آتے رہتے تھے۔

دونوں مریض دوائی لے کر چلے گئے۔ وہ سونڈ پونڈ صاحب کار سے باہر نکلے اور سلام کر کے بیچ پر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ اگر آپ نے اپنے لیے دوائی لینی ہے تو اوپر سٹول پر آجائیں تاکہ میں آپ کی نبض دیکھ لوں اور اگر کسی مریض کی دوائی لے کر جانی ہے تو بیماری کی کیفیت بیان کریں۔

وہ صاحب کہنے لگے حکیم صاحب میرا خیال ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ لیکن آپ مجھے پہچان بھی کیسے سکتے ہیں؟ کیونکہ میں ۱۵، ۱۶ سال بعد آپ کے مطب میں داخل ہوا ہوں۔ آپ کو گزشتہ ملاقات کا احوال سناتا ہوں پھر آپ کو ساری بات یاد آجائے گی۔ جب میں پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا تو وہ میں خود نہیں آیا تھا۔ مجھے خدا نے آپ کے پاس لے آیا تھا کیونکہ خدا کو مجھ

پر رحم آگیا تھا اور وہ میرا گھر آیا کرنا چاہتا تھا۔ ہوا اس طرح تھا کہ میں لاہور سے میرپور اپنی کار میں اپنے آہائی گھر جا رہا تھا۔ عین آپ کی دکان کے سامنے ہماری کار پکچر ہو گئی۔ ڈرائیور کار کا پیپر ہار کر پکچر لگوانے چلا گیا۔ آپ نے دیکھا کہ میں گرمی میں کار کے پاس کھڑا ہوں۔ آپ میرے پاس آئے اور آپ نے مطب کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ لاہر آ کر کرسی پر بیٹھ جائیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے آپ کا شکریہ ادا کیا اور کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے کچھ زیادہ ہی دیر لگا دی تھی۔ ایک چھوٹی سی بچی بھی یہاں آپ کی میز کے پاس کھڑی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی ”چلیں ناں، مجھے بھوک لگی ہے۔ آپ اسے کہہ رہے تھے بیٹی تھوڑا صبر کرو ابھی چلتے ہیں۔

میں نے یہ سوچ کر کہ اتنی دیر سے آپ کے پاس بیٹھا ہوں۔ مجھے کوئی دوائی آپ سے خریدنی چاہیے تاکہ آپ میرے منٹے کو زیادہ محسوس نہ کریں۔ میں نے کہا حکیم صاحب میں ۵، ۶ سال سے انگلیٹھ میں ہوتا ہوں۔ انگلیٹھ جانے سے قبل میری شادی ہو گئی تھی لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ یہاں بھی بہت علاج کیا اور وہاں انگلیٹھ میں بھی لیکن ابھی قسمت میں مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا۔

آپ نے کہا میرے بھائی! توبہ استغفار پڑھو۔ خدا را اپنے خدا سے مایوس نہ ہو۔ یاد رکھو! اس کے خزانے میں کسی شے کی کمی نہیں۔ اولاد، مال و اسباب اور غری خوشی، زندگی موت ہر چیز اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کسی حکیم یا ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی دوا میں شفا ہوتی ہے۔ شفا اگر ہوتی ہے تو اللہ کے حکم سے ہوتی ہے۔ اولاد دینی ہے تو اسی نے دینی ہے۔

مجھے یاد ہے آپ ہائیں کرتے جا رہے اور ساتھ ساتھ پڑیاں بنا رہے تھے۔ تمام دوائیاں آپ نے ۲ حصوں میں تقسیم کر کے ۲ لفافوں میں ڈالیں۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ میرا نام محمد علی ہے۔ آپ نے ایک لفافہ پر محمد علی اور دوسرے پر بیگم محمد علی لکھا۔ پھر دونوں لفافے ایک بڑے لفافہ میں ڈال کر دوائی استعمال کرنے کا طریقہ بتایا۔ میں نے بے دلی سے دوائی لے لی کیونکہ میں تو صرف کچھ رقم آپ کو دینا چاہتا تھا۔ لیکن جب دوائی لینے کے بعد میں نے پوچھا کتنے پیسے؟ آپ نے کہا بس ٹھیک ہے۔ میں نے زیادہ زور ڈالا، تو آپ نے کہا کہ آج کا کھانا بند ہو گیا ہے۔

میں نے کہا مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی۔ اسی دوران وہاں ایک اور آدمی آچکا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کھانا بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آج کے گھر یلو اخراجات کے لیے جتنی رقم حکیم صاحب نے اللہ سے مانگی تھی وہ اللہ نے دے دی ہے۔ مزید رقم وہ نہیں لے سکتے۔ میں کچھ حیران ہوا اور کچھ دل میں شرمندہ ہوا کہ میرے کتنے گھٹیا خیالات تھے اور یہ سادہ سا حکیم کتنا عظیم انسان ہے۔ میں نے جب گھر جا کر بیوی کو

دوائیاں دکھائیں اور ساری بات بتائی تو بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا وہ انسان نہیں کوئی فرشتہ ہے اور اُس کی دی ہوئی ادویات ہمارے من کی مراد پوری کرنے کا باعث بنیں گی۔ حکیم صاحب آج میرے گھر میں تین پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔

ہم میاں بیوی ہر وقت آپ کے لیے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ جب بھی پاکستان چھٹی آید کار پور روکی لیکن دکان کو بند چلا۔ میں کل دوپہر بھی آیا تھا۔ آپ کا مطب بند تھا۔ ایک آدمی پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے کہا کہ اگر آپ کو حکیم صاحب سے ملنا ہے تو آپ صبح ۹ بجے لازماً پہنچ جائیں ورنہ ان کے ملنے کی کوئی گارنٹی نہیں۔ اس لیے آج میں سویرے سویرے آپ کے پاس آگیا ہوں۔

محمد علی نے کہا کہ جب ۱۵ سال قبل میں نے یہاں آپ کے مطب میں آپ کی چھوٹی سی بیٹی دیکھی تھی تو میں نے بتایا تھا کہ اس کو دیکھ کر مجھے اپنی بھانجی یاد آ رہی ہے۔

حکیم صاحب ہمارا سارا خاندان انگلیٹھ سیٹل ہو چکا ہے۔ صرف ہماری ایک بیوہ بچہ ہمیں اپنی بیٹی کے ساتھ پاکستان میں رہتی ہے۔ ہماری بھانجی کی شادی اس ماہ کی ۲۱ تاریخ کو ہونا تھی۔ اس بھانجی کی شادی کا سارا خرچ میں نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ ۱۰ دن قبل اسی کار میں اسے میں نے لاہور اپنے رشتہ داروں کے پاس بھیجا کہ شادی کے لیے اپنی مرضی کی جو چیز چاہے خرید لے۔ اسے لاہور جاتے ہی بخار ہو گیا لیکن اس نے کسی کو نہ بتایا۔ بخار کی گولیاں ڈھیرین وغیرہ کھاتی اور پڑاؤں میں پھرتی رہی۔ بازار میں پھرتے پھرتے چانک بے ہوش ہو کر گری۔ وہاں سے اسے ہسپتال لے گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اس کو ۱۰۶ ڈگری بخار ہے اور یہ گرون توڑ بخار ہے۔ وہ بے ہوشی کے عالم ہی میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئی۔

اُس کے فوت ہوتے ہی خیمائے کیوں مجھے اور میری بیوی کو آپ کی بیٹی کا خیال آیا۔ ہم میاں بیوی نے اور ہماری تمام فیملی نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنی بھانجی کا تمام جینز کا سامان آپ کے ہاں پہنچا دیں گے۔ شادی جلد ہو تو اس کا بندوبست خود کریں گے اور اگر ابھی کچھ دیر ہے تو تمام اخراجات کے لیے رقم آپ کو نقد پہنچا دیں گے۔ آپ نے ناں نہیں کرئی۔ آپ اپنا گھر دکھا دیں تاکہ سلمان کا ٹرک وہاں پہنچایا جاسکے۔

حکیم صاحب حیران و پریشان یوں گویا ہوئے ”محمد علی صاحب آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں مجھے سمجھ نہیں آ رہا، میرا اتنا دماغ نہیں ہے۔ میں نے تو آج صبح جب بیوی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چنٹ یہاں آ کر کھول کر دیکھی تو مرقع مسالہ کے بعد جب میں نے یہ الفاظ پڑھے ”بیٹی کے جینز کا سامان“ تو آپ کو معلوم ہے میں نے کیا لکھا۔ آپ خود یہ چنٹ ذرا دیکھیں۔ محمد علی صاحب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ”بیٹی کے جینز“ کے سامنے کھانا ہوا تھا ”یہ کام اللہ کا ہے، اللہ جانے۔“

محمد علی صاحب یقین کریں، آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ
بیوی نے چٹ پر چیز لکھی ہو اور مولا نے اُس کا اسی دن
بندوبست نہ کر دیا ہو۔ واہ مولا واہ۔ تو عظیم ہے تو کریم ہے۔
آپ کی بھانجی کی وفات کا صدمہ ہے لیکن اُس کی قدرت پر
حیران ہوں کہ وہ کس طرح اپنے مجھے دکھاتا ہے۔
حکیم صاحب نے کہا جب سے ہوش سنبھالا ایک ہی سبق پڑھا کہ
”صبح ورد کرنا ہے“ رازق، رازق، تو ہی رازق“ اور شام کو ”شکر،
شکر مولا تیرا شکر

§§§

اقبال اور فلسفہ خودی

مصنف: یوسف



بیسویں صدی میں اسلامی فکر کے انبیاء و تجدید میں شاعر مشرق علامہ اقبال کا نام ایک روشن ترین ستار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا بھر کی ادبی تاریخ میں بہت کم ایسی شخصیات ملتی ہیں جنہوں نے علامہ اقبال کی طرح ذہنوں پر اتنے گہرے اثرات مرتب کئے ہوں اور سیاسی و سماجی دھارے کا رخ موڑ دیا ہو۔ انکا خطبہ الہ آباد ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری کی اساس بنا۔ علامہ اقبال نے پاکستان کا خواب دیکھا اور صاف صاف بتا دیا کہ ”خودی کی تلوار“ سے مسلمانان ہند کا ایک الگ آزاد اسلامی ملک وجود میں آنے والا ہے۔ اقبال کا ہی احسان ہے اور کارنامہ بھی کہ قائد اعظم کو اس جدوجہد کا رہبر بننے پر راضی کیا۔ علامہ انیس سو اڑتیس میں فوت ہوئے لیکن انکے افکار سے پاکستان، انڈیا، ایران، ترکی، افغانستان اور مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب بھی استفا وہ کر رہا ہے۔ اقبال نے ہا کھل شجیک کہا تھا: کہ

خاک دلولہ تبارہ دیا میں نے دلوں کو

لاہور سے تا بہ خاک بخارا و سر قند

علامہ اقبال کی شاعری کا بنیادی مرکز ”فلسفہ خودی“ ہے۔ انہوں نے خودی کے فلسفے کو اس قدر شاعرانہ اور بے مثال انداز میں پیش کیا ہے کہ اس پر غور و فکر کرنے اور پھر عمل کرنے سے نہ صرف فرد بلکہ اقوام بھی اپنی زندگیوں میں انقلابی تبدیلی لاسکتے ہیں۔ اور وہ شیطان کی بیرونی کی بجائے ایک اللہ کی بندگی کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔

اب ہم اس پر تفصیل کے ساتھ بات کرتے ہیں۔

انسان کا وجود: انسان کا وجود دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک اسکا بدن ہے، اسکا ”خاک و جود“ ہے اور دوسری

چیز اسکی ”روح“ ہے۔

در حقیقت انسان ”خاک و جود“ کے تقاضے پورے کرنے میں دن رات مصروف ہے۔ وہ اس عمل میں اتنا لگن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا ”اصل وجود“ اپنی ”روح“ کو بھول جاتا ہے۔ وہ کھانے، پینے، معاشی سرگرمی، خاندان کے ضروریات پورے کرنے اور دیگر انسانی معاملات میں بہت آگے نکل جاتا ہے۔ یوں آہستہ آہستہ وہ مادہ پرست، دنیا پرست اور آخرکار شیطان کا کارکن بن جاتا ہے۔ وہ روح کے تقاضے پورے کرنا بھول جاتا ہے۔ وہ دنیا کی بھول بھلیوں میں اپنے خالق، اپنے رب کو فراموش کر دیتا ہے۔ وہ دن رات مادی وجود کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ یہ ”نفسِ لہارہ“ کی کیفیت ہے اور بہت بڑی تباہی ہے۔

انسانی روح کیا ہے؟

انسان کی اصل حقیقت اسکی پاکیزہ روح ہے۔ انسانی روح کی وجہ سے اسے مسجود ملائک کا درجہ ملا ہے۔ روح کا تعلق مذہب اور رحمتیت سے ہے۔ یہی روح اسے دیگر حیوانوں سے الگ کرتی ہے۔ جسم کے مرنے سے روح نہیں مرتی۔ وہ واپس اپنے خالق کی پاس چلی جاتی ہے۔ اور تب انسان دنیاوی زندگی کا جواب دہ ہوتا ہے۔ جس جسم کے تقاضے پورے کرنے سے ”روح“ کو چین نہیں مل سکتا۔

اقبال کا فلسفہ خودی ڈارون کی زہریلی تھیوری آف ہیومن ایولوشن کا تریاق ہے:

ڈارون نے کہا تھا کہ انسان حیوان کی ترقیافتہ شکل ہے۔ حیوان اور انسان ایک ہی چیز ہے۔ بس انسان نے ذرا ترقی کی اور موجودہ تہذیب تک پہنچا۔ انکے مطابق انسان محض حیوانی جہتوں کا حامل ہے۔ مان، بہن، بیٹی اور بیوی میں کوئی فرق نہیں۔ حیوان کی طرح انسان جس سے چاہے اور جب چاہے، جنسی اختلاط کر سکتا ہے۔ حیوانوں کی طرح انسانوں کا بھی کوئی مذہب نہیں ہونا چاہئے۔ گویا ”جانور“ انسان کا باوجود آدم ہے۔ چو ناچے ”ڈارون“ کے اس تباہ کن نظریے نے مذہب، ادب، اخلاقیات، شرف انسانیت کا جنازہ نکال دیا ہے۔

اقبال کا ”فلسفہ خودی“ ڈارون کے اس تھیوری کا توڑ ہے۔ اور انکے زہریلے اثرات کا تریاق بھی ہے۔ اقبال کی خودی کا فلسفہ انسان کو جانور سے بلند تر حقوق بتاتا ہے۔ یہ ہمیں حیوانی طرز حیات سے بلند کر کے رحمتیت کا راستہ دکھاتا۔ انسان کے خاکی وجود سے ماوراء بھی اسکی ایک عظیم ہستی ہے، جسے فنا نہیں۔ انسان کی زندگی کا اصل مقصد اللہ کی خوشنودی ہے۔

تو راز کن دکھن ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا

خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجمان ہو جا

خودی کی معنی: خودی کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ خودی محمود ہے، مقبول ہے، قابل قبول ہے، قابل ستائش ہے، اچھی چیز ہے۔ یہ ہر باطل سے استثناء اور بے نیا زی ہے۔ اس میں

انسان اپنے اندر کی روشنی کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنی اصلیت کی تلاش کرتا ہے۔ وہ نفسِ مطمئنہ سے بھی آگے کے سفر پر ریاقت کرتا ہے اور اپنے روحانی تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور یوں اپنے مالک، اپنے رب تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ خودی انسان کی انا ہے، عزت ہے، غیرت ہے، اسکی اندر کی ”میں“ ہے، اسکی روح ہے۔ اور یہی اسکی اصل پہچان ہے۔ خاکی وجود کے علاوہ جو اسکی روح ہے اسکی پہچان اور عرفان انسان کا اصل مقصد حیات ہے۔ اسی عرفان کی وجہ سے بندہ اپنے رب کی رضا کے لئے دن رات لگ جاتا ہے۔ حیوانی خواہشوں کی پوجا کی بجائے انسان اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔

اسکا ایک دوسرا مطلب بھی ہے: کہ انسان جب نفسِ لہارہ کا پٹیا ری بن جاتا ہے تو ایسے بندے کی خودی اسے حیوان کے برابر کر دیتی ہے۔ اس حالت میں انسان اپنے نفس کا غلام بن جاتا ہے۔ وہ اپنے اندر کی روشنی کو بھول کر اپنی دنیا پرستی اور ہوس پرستی کی وجہ سے خاکی وجود کی پرستش کرتا ہے۔ تب یہ خودی بری چیز ہے، قابل مذمت ہے اور خودی کی یہ کیفیت بہت مذموم ہے۔

اقبال خودی کو ان دونوں مطالب میں استعمال کرتا ہے۔ وہ نفسِ لہارہ والی خودی کو ترک کرنے اور نفسِ مطمئنہ والی خودی کو اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔ ”طلوعِ صحر“ میں اقبال کہتا ہے:

خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سر زندگانی ہے

نکل کر حلقہ شام و صبح سے جداواں ہو جا

فلسفہ خودی کی اساس: علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کا ماخذ قرآن حکیم کی ”سورة حشر آیت نمبر اٹھارہ“ ہے۔ ”ذکر اسرار احمد مرحوم متعدد مرتبہ اپنے لیکچرز میں اس حقیقت کی گواہی دے چکے ہیں۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب انسان اپنے پیدا کرنے والے اور تحقیق کرنے والے رب کو بھلا دیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ بھی ایسے انسان کو اپنا آپ بھلا دیتا ہے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کیا تاکہ وہ اپنے من میں ڈوب کر اپنے رب کو تلاش کرے۔ وہ دیکھے کہ اسکی اصل حقیقت کیا ہے، ملائکہ سے اسکو سجدہ کروایا گیا ہے۔ وہ ایک بلند مخلوق ہے۔ وہ حیوان نہیں ہے بلکہ اللہ نے اسے اشرف المخلوقات بنا یا ہے لہذا وہ اپنی پاکیزہ روح کو پہچانے۔ اپنے اندر جھانکے تو اسے معلوم ہوگا کہ اسکی زندگی کا کوئی عظیم مقصد ہے۔ اس مقصد کے حصول میں اپنی زندگی گزارے۔ لیکن اگر انسان ایسا کرنے کی بجائے اپنے خالق کو بھول بھال کر نفسِ لہارہ کا غلام بن جائے، شیطان کا پنجاری ری بن جائے اور دن رات اپنے خاکی وجود کی ضرورتیں پوری کرنے میں لگ جائے تو پھر اللہ تعالیٰ ایسے انسان کو اپنی رحمت اور حدیث سے دور کر دیتا ہے، وہ مردود ہو جاتا ہے۔ جو انسان اپنے رب کا ناشکرہ بن جاتا ہے، اللہ سے بے خوف ہو جاتا ہے تو اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی اصلیت اور حقیقت کو بھی بھول جاتا ہے۔ پھر وہ نفسِ آمارہ اور نفسِ آوارہ

میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ عظیم خسارہ ہے۔ یہ سب سے بڑی تباہی ہے۔ اقبال مسلمانوں کو کہتا ہے کہ:

ع بے خبر تو جو ہر آئینہ ایم ہے

تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے۔

وہ کہتا ہے کہ مسلمان اپنے آپکو اپنے تن من کو نفسِ لہارہ کی پیروی کرنے میں فقط چند دنیوی اشیاء کے حصول میں نہ کھیلے۔ اگر وہ اپنے رب کا ناشکرا ہے تو پھر اللہ تو بے نیاز ہے۔ پھر خسارے میں تو انسان ہی رہے گا۔

لہذا اقبال نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو اس خسارہ عظیم اور نفسانی آوارگی سے واپس روحانی زندگی میں لانے کا واحد نسخہ کیا ہے ’ فلسفہ خودی‘ میں ہے۔ جب فلسفہ خودی سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف مراجعت کا سفر اختیار کر لیں گے تو دین و دنیا دونوں میں فلاح پالیں گے۔ انکے خیال میں مسلمانوں کی پسماندگی، غلامی، جہالت اور دنیا پرستی کا علاج ’’ فلسفہ خودی ‘‘ میں پنہاں ہے۔

اقبال کہتا ہے:

ع دید عشق میں اپنا مقام پیدا کر

نیا زمانہ نئی صبح و شام پیدا کر

میرا طریقِ امیری نہیں، فقیری ہے

خودی نہ سچ غریبی نام پیدا کر

خودی کے خواص:

اقبال کے شاہین کے جو صفات ہیں، وہی فلسفہ خودی کے خواص ہیں

بلند پرواز، تیز نگاہ، کسی اور کا مارا ہوا شکار نہ کھانا، خلوت پسندی۔ جب انسان نفیس ترین خودی کی منزل کی طرف اپنا سفر شروع کرتا ہے تو وہ ان صفات کا حامل ہوتا ہے۔ وہ فقر و عشق سے بھی معذور ہوتا ہے۔ تب وہ اپنی منزل کے اختتام پر مردِ مومن اور مردِ حق بن جاتا ہے۔ تب وہ خودی کے دیگر مدارج بھی طے کر کے اللہ کا صحیح کارکن اور قبولِ بندہ بن جاتا ہے۔

خودی کے چھ پھل کا درخت آتا ہے۔

عشق کے بغیر کوئی انسان نفسِ لہارہ سے بلند ہو کر نفسِ راضیہ کے مدارج طے نہیں کر سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ انسان نفسِ لہارہ کے دلدل سے خاکی وجود کو نکال کر فخرِ دی محمود، کی طرف کا روح پرور سفر، عشق کے بغیر نہیں کر سکتا۔

خودی کے مدارج:

نفسِ لہارہ۔ نفسِ لوامہ۔ نفسِ طحڑ۔ نفسِ مطمئنہ۔ نفسِ مرضیہ۔ نفسِ راضیہ۔

نفسِ لہارہ: اسکا مطلب ہے، دنیا پرستی، مادہ پرستی اور شیطان پرستی۔ تکبر، غرور اور انکار حتیٰ کہ انسان کفر کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

نفسِ لوامہ: انسان جب مادہ پرستی ترک کرتا ہے اور رب کی رضا کی طرف سفر شروع کرتا ہے۔ اپنے رب کی رضا کے لئے عبادت اور ریاضت شروع کرتا ہے۔ یہ کامیابی کا راستہ ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب ایک مسلمان کو اپنی اصلیت کا احساس ہو جاتا ہے کہ اللہ نے اسے خاکی وجود کے ساتھ ساتھ اسکے اندر ایک نفیس روح بھی عطا فرمائی ہے۔ اس روح کی پہچان اور اسکے تقاضے پورے کرنا لازم ہے۔ رب نے اسے اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور یہ کہ مادہ پرستی اور خدا کی مرضی کے خلاف دنیا پرستی خسارے کا سودا ہے۔

نفسِ طحڑ: خودی اور خود آگاہی کے راستے پر سفر کرتے کرتے انسان اس مقام پر آجاتا ہے جب رب کی طرف سے نیک اور پاکیزہ خیالات آنے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی ملتی ہے۔

نفسِ مطمئنہ: اس مقام پر انسان خدا کا مخاطب ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کے قریب اور شیطان سے کافی دور چلا جاتا ہے۔ انسان کو اطمینان قلب نصیب ہو جاتا ہے۔ دنیوی آسائشیں اور دلکشاں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے رب کی رضا پر خوش رہتا ہے۔ کوئی شکوہ شکایت نہیں رہتی۔

نفسِ راضیہ: بندگی اور خودی کا سفر جب مزید آگے بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ انسان سے راضی ہو جاتا ہے۔ بندہ اپنی بندگی کے اس مقام پر اپنے رب کو راضی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایک مسلمان اپنی عبادت اور ریاضتوں سے اپنے محبوب رب کو خوش کر دیتا ہے۔ تب اللہ اپنے بندے فرماتا ہے کہ تو میرا سچا بندہ ہے۔ میں تیری بندگی سے راضی ہوں۔ اقبال کہتا ہے:

ع ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن

گفتار میں کردار میں اللہ کی بڑبان

نہ تاج و تخت میں ہے نہ تفکر و سپاہ میں ہے

جو بات مر و قنندر کی نگاہ میں ہے

نفسِ مرضیہ: خودی اور کامل بندگی کی بلندی کا یہ آخری مقام ہے خدا تعالیٰ سب سے بڑا قدردان ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب اللہ پاک اپنے بندے سے اتنا خوش ہو جائے کہ اپنے بندے کی مرضی کے مطابق فیصلے کرنے لگے۔ جب انسان مقتدر بن جائے۔ اس مقام پر انسان اپنے تقدیر خود لکھوانے لگتا ہے۔ اللہ اسکی ہر مراد پوری کرتا ہے۔ ہر سفارش قبول کرتا ہے۔ اللہ رعا لیٰ اپنی خلائق اسکے تابع کر دیتا ہے۔ خودی کے اس آخری درجے پر بندہ اپنے خالق کی اس قدردانی کا حقدار بن جاتا ہے۔

علامہ اقبال نے اس مقام کی صحیح عکاسی کے لئے ہی وہ مشہور شعر کہا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اور

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکی زورِ بازو کا

لگاؤ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

حضرت علامہ اقبال کا ’’فلسفہ خودی‘‘ انکی شاعری کا نچوڑ ہے۔ یہ وہی فلسفہ ہے جسے برصغیر کے کمزور اور غلام مسلمانوں نے اپنا کر اپنے لئے ایک الگ آڈیو وطن پاکستان حاصل کیا۔ اس فلسفے پر عمل پیرا ہو کر ہم آج بھی اپنی دنیوی زندگی کا رخ موڑ سکتے ہیں تاکہ فانی انسان جو کہ اپنی اصلیت، اپنی روح کی تقاضوں کو بھول چکا ہے وہ ایک اللہ کی مرضی کے مطابق اپنی روح کی پرورش شروع کر سکے۔

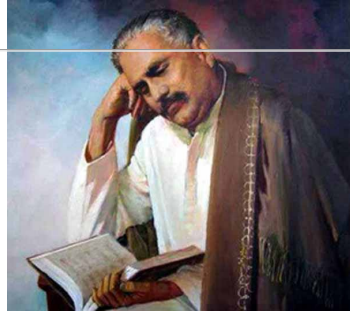
قرآن مجید کی سورۃ حشر میں اللہ نے جس نوع کے انسانوں کو نا پسند فرمایا ہے، ہمیں چاہئے کہ ہم ایسے انسانوں کا راستہ چھوڑ دیں جنہوں نے رب کو کھٹا دیا ہے۔ وہ خسارے اور مکمل تباہی کا راستہ ہے۔ اقبال ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ فانی وجود کو اتنا وقت دو جتنا انسانی بدن نے اس دنیا میں رہنا ہے اور اپنی ’’روح‘‘ کی پاکیزگی کو اتنا وقت دیں جتنا اس نے وہاں اس جہاں میں اپنے خالق کے پاس رہنا ہے۔

اقبال کا ’’ فلسفہ خودی‘‘ اپنانے میں انسانیت کی فلاح ہے۔ اس میں شیطان کی غلامی سے نجات ہے۔ سچ یہ ہے کہ مادہ پرستی اور نفسِ آمارہ کا راستہ چھوڑ کر اقبال کے فلسفہ خودی کو اپنا کر اور سورۃ حشر کے مطابق ہم اپنے رب کی رضا کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔

’ اسرارِ خودی ‘ میں اقبال کہتا ہے:

اے مسلمان! تُو خودی کو نہ چھوڑ اور خود کو اس طرح بنالے، جسکا انجام بقاء پر ہو۔

تیری چمک دمک خودی کی نور سے ہے۔ اگر تُو اپنی خودی کو مضبوط کر لے، تُو تجھے دوام حاصل ہو جائے۔



چینی کے بغیر چینی چائے کا لطف

مصنف: یوسف

گی اور اگر فوری بعد پی تو بد ہضمی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ ایک اور اہم بات جس کا چینی افرو بہت خیال رکھتے ہیں کہ چائے کے ساتھ کسی بھی قسم کی ادویات کا استعمال نہیں کریں گے ایسا نہیں کہ پاکستان میں ہم بخار یا سر درد کی گولی بھی اکثر چائے کے ساتھ ہی لیتے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ایک اور بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ دفاتر، گھر اور ہوٹل میں پی جانے والی چائے میں بھی فرق ہو گا مثلاً دفاتر میں زیادہ گرین ٹی یا سبز چائے استعمال کی جائے گی اس کی وجہ بتائی جاتی ہے کہ سبز چائے میں ایسے اجزاء پائے جاتے ہیں جو کمپیوٹر سے نکلنے والی شعاعوں سے انسانی جسم کو بچانے میں مفید ثابت ہوتے ہیں اور انسانی جسم میں سبز چائے نمی کی مقدار کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اگر چین میں چائے کی مختلف اقسام کے حوالے سے دیکھیں تو ان کو گرین ٹی، بلیک ٹی، ڈارک ٹی، اولانگ ٹی اور وائٹ ٹی میں تقسیم کیا گیا ہے اور چائے کی ہر قسم کے ساتھ کچھ کہادیتیں یا کچھ روایات منسوب ہیں۔ مثلاً گرین ٹی کو سادگی سے منسوب کیا جاتا ہے اور عام طور پر جنوبی چین میں رہنے والے باشندوں کے حوالے سے کہا جاتا ہے وہ اس کو زیادہ استعمال کرتے ہیں، بلیک ٹی کو ایسے افرو سے منسوب کیا جاتا ہے جو نرم دل اور شرمیلے ہوتے ہیں، اولانگ ٹی کو ملنسار اور عام طور پر فلسطیانہ مزاج رکھنے والے افرو کی پسند قرار دیا جاتا ہے اسی طرح ڈارک ٹی کو بزرگ دانا افرو کی پسند میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایک اور بات نہایت اہم ہے کہ پورے چین میں چینی کے بغیر چائے پینے کا رواج ہے کیونکہ چین کے لوگ چینی کے زیادہ استعمال کو صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ قرار دیتے ہیں اور مونپے کی بڑی وجہ بھی چینی کے زیادہ استعمال کو قرار دیتے ہیں۔

اگر معاشی اعتبار سے دیکھیں تو چین میں چائے کی صنعت ملک کی معاشی ترقی میں بھی ایک کلیدی کردار ادا کر رہی ہے اور چین کا شمار دنیا کے ان بڑے ممالک میں ہوتا ہے جو دنیا کے دیگر ممالک کو چائے کی برآمد میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ چین کی حکومت بھی اس صنعت کی ترقی کے حوالے سے اقدامات کرتی رہتی ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے جہاں ملکی ضروریات کو پورا کیا جا سکے وہاں بیرونی ممالک میں بھی معیاری چائے برآمد کی جا سکے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ملک کے مختلف حصوں میں چائے کی صنعت کی ترقی اور ملک میں ٹی کلچر کے فروغ کے لیے بھی مختلف سیمینارز، کانفرنسز اور دیگر تقاریب کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ جو سب بھی چین آئیں چینی چائے سے ضرور لطف اٹھائیں لیکن وہ بھی بغیر چینی کے۔

§§§

چینی ثقافت میں چائے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اگرچہ پاکستان میں پی جانے والی چائے سے چینی چائے قدرے مختلف ہے لیکن چائے سے منسلک کچھ روایات، چائے سے جڑے کچھ لوازمات اور لوگوں کی پسندیدگی کے مختلف معیارات چینی چائے کو ایک خاص رنگ دیتے ہیں۔ چینی معاشرے میں اگر چائے کی تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں پانچ ہزار سال پیچھے جانا پڑے گا۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک چینی بادشاہ شین ٹونگ نے اپنے دور حکومت میں جہاں دیگر فرمان جاری کیے ان میں ایک حکم یہ بھی تھا کہ صحت مند اور توانا رہنے کے لیے پینے کے پانی کو استعمال سے قبل ضرور اہلا جائے۔ گریوں کی ایک دوہر اپنی سلطنت کے ایک دور دراز علاقے کے دورے کے دوران بادشاہ اور ان کے درباری ایک مقام پر سنانے کی غرض سے رکے اور بادشاہ سلامت کے لیے پانی اہلا جا رہا تھا کہ اسی دوران نزدیکی جھاری سے کچھ پتیاں اٹھتے پانی میں آگری اور پانی کا رنگ فوری تبدیل ہو گیا۔ اب بادشاہ کے دل میں پانی کے اس نئے ذائقے کو چکھنے کی خواہش نے جنم لیا، جب انہوں نے پتیوں ملا رنگ دار پانی پیا تو ذائقے دار بھی لگا سو یہیں سے چائے کا آغاز ہوتا ہے اور یہ دور تھا 2337 قبل مسیح۔ اس وقت سے لیکر آج تک چین میں چائے کو مختلف تقاریب میں نمایاں اہمیت حاصل ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ چائے کا راج ہے تو بے جا نہ ہو گا۔

□

اگر چینی معاشرے میں چائے کے استعمال کی بات کی جائے تو اس میں بھی آپ کو مختلف رنگ ملیں گے۔ کچھ لوگ چائے کو پیاس بھانے اور پانی کے فیم الہل کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو کچھ کے نزدیک چائے پینے سے ان کی حقیقی صلاحیتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ بعض افرو تو فطری ماحول سے محبت، موسیقی میں دلچسپی اور باہمی روابط استوار کرنے میں بھی چائے کے معترف نظر آتے ہیں۔ مزید دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ چین میں معیاری چائے کے بھی پیمانے وضع کیے گئے ہیں ایسا ہر گز نہیں کہ جس طرح پاکستان میں اکثر کہا جاتا ہے کہ بس چائے ہوئی چاہیے چاہے کسی ٹرک ہوٹل کی چائے ہو یا کسی فائبر اسٹار ہوٹل، یہ الگ بات ہے کہ پاکستان میں لوگوں کی اکثریت ٹرک ہوٹل کی چائے کو کسی بھی بڑے ہوٹل کی چائے سے بہتر قرار دیتی ہے، پتیاؤں کی بات ہو رہی تھی تو چین میں چائے کو جن خصوصیات کی بناء پر پرکھا جاتا ہے اس میں پہلی خاصیت چائے کی رنگت، دوسری چائے کی خوشبو، تیسری خاصیت چائے کا ذائقہ ہے لیکن جناب بات یہیں ختم نہیں ہوتی مزید دو چیزیں اور بھی شامل ہیں جو پاکستان سمیت دیگر دنیا سے قدرے مختلف ہیں پہلی چیز پانی کا معیار مطلب یہ کہ پانی کون سا استعمال کیا گیا ہے اور آخری چیز چائے سیٹ، مطلب چائے پیش کرنے کے لیے کس قسم کے برتن استعمال کیے گئے ہیں۔ مختصراً یہی کہ برتن چتنا معیاری اور اچھا ہو گا اتنی ہی چائے کے لیے پسندیدگی بڑھے گی، ویسے معیاری کو آپ جتنے برتن سے بھی تعبیر کریں تو کوئی حرج نہیں۔

اب چائے تو پیش کر دی گئی اگلا مرحلہ پینے کا ہے تو جناب چین میں چائے پینے کے بھی کچھ اصول ہیں مثلاً چائے آپ نے گرم گرم ہی ختم کرنی ہے ایسا نہیں کہ ساتھ ساتھ دفتر کا کام بھی جاری ہے اور چائے بے شک ٹھنڈی ہو جائے، اس حوالے سے کہا جاتا ہے کہ چائے میں موجود مفید اجزاء سے لطف اندوز صرف گرم چائے سے ہی ہوا جا سکتا ہے۔ ایک اصول یہ بھی ہے کہ زیادہ سخت یا اگر پاکستانی لفظ استعمال کریں تو زیادہ کرک چائے نہیں پینی ہے بقول چینی افرو کے کہ زیادہ کرک چائے انسانی معدے کے لیے نقصان دہ ہے اس کا معیار یہ طے کیا گیا ہے کہ پورے دن میں آپ بارہ سے پندرہ گرام کے درمیان چائے کی پتیاں استعمال کریں گے۔ چائے پینے کے لیے بہترین اوقات کا تعین بھی کیا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ جب ہی چاہا چائے پی لی، چینی افرو کھانے سے کچھ دیر قبل یا فوری بعد چائے نہیں پیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کھانے سے پہلے چائے پی لی تو بھوک ختم ہو جائے

شپ اہم ہیں۔ شہر کے قابل دید مقامات میں ایئر پورٹ، عجائب گھر، پنجاب یونیورسٹی، باغ جناح، شالامار باغ، مینار پاکستان، مال روڈ، انارکلی گلشن اقبال اور ریس کورس چلک شامل ہیں۔

مینار پاکستان کا ڈیزائن ترک ماہر تعمیرات نصر الدین مرآت خان نے تیار کیا۔ تعمیر کا کام میاں عبدالحق اینڈ سیٹی نے 23 مارچ 1960 میں شروع کیا۔ 21 اکتوبر 1968 میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس پر کل لاگت 75 لاکھ روپے آئے۔



بادشاہی مسجد لاہور میں شاہی قلعے کے نزدیک واقع ہے۔ اس مسجد کو مغل بادشاہ شا جہاں نے بنوایا تھا۔ اس میں دو لاکھ کے قریب نمازی نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے چاروں کونوں میں بہت اونچے مینار ہیں۔ مینار پر چڑھنے کے لیے باقاعدہ کٹ لینا پڑتا ہے۔ اس مسجد کے درمیان میں بڑا حوض ہے۔

مسجد میں تین بڑے بڑے سنگ مرمر کے گنبد ہیں۔ ان پر مینا کاری اور گل کاری کی ہوئی ہے۔ جسے دیکھ کر مغلیہ راج کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مسجد میں داخل ہونے کے لیے بچاس سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ یہاں لوگوں کی بڑی تعداد جمعہ اور عیدین ادا کرتے ہیں جبکہ پانچوں نمازوں میں بھی بہت رش دیکھنے میں آتا ہے۔

§§§

لاہور ایک قدیم شہر

مصنف: یوسف

تحریک پاکستان کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے۔ جتنی خود مسلمانوں کی۔ اس لیے کہ پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد پر حاصل کیا گیا۔ دو قومی نظریے کی بنیاد ہندوستان میں اس دن پڑ گئی تھی۔ جس دن سائل مالا بار کی ریاست گدگد نور کے حکمران راجہ سامری نے اسلام قبول کیا تھا۔ رفتہ رفتہ دین اسلام کی شواہیں بھیلنے لگیں۔ محمد بن قاسم نے 712 میں سندھ فتح کر کے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اسلامی حکومت کے قیام سے انگریز حکومت تک مختلف مسلمان خاندانوں کی حکمرانی میں برصغیر میں اسلامی حکومت قائم رہی۔ اور نگ زیب کی وفات کے بعد اس کے نا اہل چاشنیوں کے باعث برطانوی حکومت نے اسلامی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ ہندوؤں نے گلہ جوڑ کرستے ہوئے اسلامی دشمنی کے سبب وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان کرانے کی بھرپور کوشش کی۔

1938 میں سندھ مسلم لیگ کی اکثریت کے ساتھ آزاد ملک کے حق میں باقاعدہ ایک قرارداد منظور کی اور 23 مارچ 1940 کو مسلم لیگ کے 27 ویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کا مطالبہ کر دیا۔



لاہور صوبہ پنجاب پاکستان کا دار الحکومت اور پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ یہ پاکستان کا ثقافتی، تعلیمی اور تاریخی مرکز ہے۔ اسے پاکستان کا دل بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر دریائے راوی کے کنارے واقع ہے۔ اس کی آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے۔ شاہی قلعہ، شالامار باغ، بادشاہی مسجد، مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ نور جہاں مغل دور کی یادگار ہیں۔ لاہور کو پہلے عروس الہند لاہور بھی کہتے تھے اور یہ علاقہ ملتان کی عظیم سلطنت کا حصہ ہوتا تھا۔

لاہور کی مغلیہ دور میں بھی اپنی ایک حیثیت رہی ہے۔ بابر پہلے سے ہی ہندوستان پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دولت خان لودھی کی دعوت نے اس پر مہمیز کا کام کیا۔ لاہور کے قریب بابر اور ابراہیم لودھی کی افواج کا پہلا ٹکراؤ ہوا۔ جس میں بابر فتح یاب ہوا۔ لیکن جب اسے دولت خان کی سازش کی اطلاع ملی۔ جس پر وہ اپنا ارادہ ختم کر کے لاہور کی جانب بڑھا۔

اس شہر میں کئی بزرگوں اور صوفیائے کرام کے مزارات ہیں جن میں حضرت داتا گنج بخش، حضرت میاں میر، بلوچال حسین، حضرت شاہ ابوالمعالی، حضرت موح دریا بخاری، حضرت گھوڑے شاہ، حضرت شاہ جمال حضرت شاہ محمد غوث اور حضرت میاں وڈھا شامل ہیں۔ لاہور کا موجودہ شہر کئی جدید بستیاں اور عمارات سے آراستہ ہے۔ ان میں ماڈل ٹاؤن، گلبرگ، ڈیفنس، سبزہ زار گرین ٹاؤن اور ٹاؤن

مردے

مصنف: یوسف

گنگھوٹے جیران کردیہاں ان کی لاجواب یادداشت نے میرے دل و دماغ کے کئی چراغ روشن کر دیئے۔ میں جتنی دیر پاکستان میں رہتا ہوں ان سے جی بھر کر باتیں کرتا ہوں، ان کی ڈھیر ساری باتیں سنتا ہوں جو وہ سارا سال میرے لئے جمع کر کے رکھی ہوتی ہیں۔ میں جب ٹیلیفون پر ان کو سلام کرتا ہوں تو ان کی خوش کلائی سے میرا دل مہلک ہو کر رہ جاتا ہے لیکن مختصر سی بات کر کے یہ کہہ کر ختم کر دیتی ہیں کہ تمہیں خواہ مخواہ اس کا زیادہ مل آئے گا۔ آؤ گے تو خوب باتیں کریں گے۔

پانچ سال پہلے انہی دنوں میں پاکستان میں قتل آہستہ آہستہ سورج چڑھنے لگا، بجلی نہیں تھی تو گرمی بڑھنے لگی اور پھر سارا محلہ وقت سے پہلے ہی جاگ اٹھا۔ منگل بیٹے نے اٹھنے ہی آواز لگائی: "مائی کوئیو"۔ تب سب سے چھوٹے کی آواز آئی، بھائی میں آپ سے جیت گیا۔ میں نے ماما کو سب سے پہلے "وش" کیا۔ تم تو اپنے نمبر بڑھاتے رہتے ہو اور پھر دونوں میں تھوڑی دیر ٹھہرا مجھے سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے پوچھا آج ایسا کون سا خاص دن ہے؟ پاپا! آج مردے ڈے ہے، چھوٹے نے آواز لگائی۔ تب مجھے معلوم ہوا۔ پھر اس پر بحث ہونے لگی کہ کون سا بچہ اچھا ہے۔ کیا نتیجہ نکالیں گے؟ نہیں معلوم۔

میں کچھ دیر تک تو سوچتا رہا اور پھر خود بخود میرے پاؤں ان کے گھر کی سمت چل پڑے۔ وہ مجھے باہری مل گئیں۔ کسی ہیں آپ ماں جی..... بہت شرمیلی ہیں وہ، مسکرائیں اور کہنے لگیں تم کیسے ہو؟ آج صبح سویرے ہی..... جی ماں جی آپ کو سلام کرنے آ گیا۔

اور ہاں ایک اور بات..... میں آپ کو "وش" کرنے آیا ہوں۔ کس بات کی "وش"؟ انہوں نے پوچھا۔ ماں جی! آج مردے ڈے ہے ناں۔ چپتے رہو میرے بچے، سدا خوش رہو، خوشیاں دیکھو۔ ان کی آواز کا زیروم میں کیسے تحریر کروں اور ان کے آنسو کیسے صفحہ پر نکھروں۔ تھوڑی دیر آسمان کی طرف نکلی بندھ کر دیکھتی رہیں، بالکل گم سہ۔ آپ ٹھیک تو ہیں ماں جی! میری آواز سن کر چونک سی گئیں اور وہاں اسی دنیا میں لوٹ آئیں۔ اب تو تہارے سر کے بالوں اور داڑھی میں کافی سپیدی آگئی ہے، کیا تہارے پوتے پوتیاں تم سے کہانی سننے کی فرمائش کرتے ہیں؟ جی ہاں، کبھی بکھارو، مگر آج کل تو اسکول کا ہوم ورک اور بعد میں کمپیوٹر پر بچوں کی مصروفیت کے بعد دوستوں سے موبائل فون کی گپ شپ اور ٹیکسٹ پیغامات نے گوشت میں عجیب اور ذہنی پیدا کر رکھی ہے، بچوں کے پاس اب بڑوں کے پاس جتنے کی فرصت کہاں؟

تم نے مجھے "مردے ڈے" پر "وش" کر کے ماں جی تو ان لیا اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ میں تم سے عمر میں کافی بڑی ہوں۔ چلو آج ہم دونوں ایک بھولی بری روایت کو قائم کرتے ہیں۔ کہانی سنو گے؟ انہوں نے اچانک مجھ سے یہ فرمائش کر دی۔ "مردے ڈے کیوں نہیں، مدت ہوئی مجھے کوئی کہانی سننے ہوئے"۔ انہوں نے ایک کہانی سنائی۔ آپ بھی سنیں:

ایک شخص اپنی ماں کو پھول بھجوانے کا آرڈر دینے کے لیے ایک گل فروش کے پاس پہنچا۔ اس کی ماں دو سو میل کے فاصلے پر رہتی تھی۔ جب وہ اپنی کار سے نیچے اترا تو اس نے دیکھا کہ دکان کے باہر فٹ پاتھ پر ایک نو عمر لڑکی بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ وہ شخص اس لڑکی کے پاس آیا اور اس کے رونے کا سبب پوچھا۔ لڑکی بولی: میں اپنی ماں کے لیے سرخ گلاب خریدنا چاہتی ہوں لیکن میرے پاس صرف پچاس پنس ہیں جبکہ گلاب کی قیمت دو پاؤنڈ ہے۔ یہ سن کر وہ شخص مسکرایا اور اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا، میرے ساتھ اندر چلو میں تمہیں گلاب دلا دیتا ہوں۔ اس نے پنی کو گلاب خرید کر دے دیا اور اپنی ماں کے لیے پھولوں کا آرڈر بک کروا دیا۔ دکان سے باہر آنے کے بعد اس نے لڑکی کو گھر تک پہنچانے کی پیشکش کی۔ یس پلیز! لڑکی نے جواب دیا آپ مجھے میری والدہ کے پاس لے چلیں۔ لڑکی کی رہنمائی میں وہ ایک قبرستان تک پہنچے۔ لڑکی نے وہ سرخ گلاب ایک تازہ بنی ہوئی قبر پر رکھ کر دعا مانگنے لگی۔ وہ شخص پلٹ کر گل فروش کے پاس پہنچا اس نے اپنا آرڈر منسوخ کر لیا اور ایک گل دست لے کر فوری اپنی ماں سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

آخری فقرہ کہتے ہوئے ان کی آواز کچھانے لگی تو میں نے اپنی جھلی گردن اٹھا کر ان کے چہرے پر نظر ڈالی تو انہوں نے منہ پھیر لیا کہ میں ان کی آنکھوں کی چٹلی نہ پکڑ لوں۔ سنا ہے تم اخبارات میں لکھتے ہو؟ گلتا ہے جو سچے اپنی ماں سے ہزاروں میل دور رہتے ہیں، اب کیا وہ اپنی ماں کی قبر پر سرخ گلاب رکھ کر ہی محبت کا اظہار کریں گے؟ کتنا مشکل ہے اس طرح بیٹا.....! "اس سوال

کہیں سے بھی نکلی ہوئی نظر نہیں آتیں وہ۔ ہر دم ہر کام کے لیے کمر بستہ، ہر لمحہ مسکراتی ہوئی، اکثر دکان پر نظر آتی ہیں۔ ایک کا پی ان کے ساتھ سفر میں رہتی ہے جس پر دکاندار سودا سلف دے کر لکھ دیتا ہے اور پھر ہر ماہ پیسے وصول کر لیتا ہے۔ کپڑے مناسب ہی ہوتے ہیں۔ کبھی دی لینے جارہی ہیں، صبح سویرے چھوٹے بچوں کو اسکول چھوڑنے جارہی ہیں، دوپہر میں ان کا بسٹ اٹھائے آ رہی ہیں۔ شام کو بچے جب گلی میں کھیلنے ہیں تو وہ ان کی نگرانی کرتی ہیں۔ لڑائی ہو جائے تو بچوں میں صلح کرائی ہیں اور تھانے کیا کیا۔ کبھی ایک بچہ کے ساتھ جارہی ہیں کبھی دوسری کی دولا رہی ہیں۔ ہر دم تازہ دم۔ میں انہیں اکثر ہی دیکھتا ہوں اور چھٹی والے دن تو خاص طور پر۔ انوار کو صبح سویرے ہر طرف سناٹا ہوتا ہے بندہ نہ بندے کی ذات لیکن وہ اللہ کی بندی اس دن کیدار یوں سے گھاس پھوس الگ کرتی ہیں، خشک چپے کھینچے ہیں، پھر پائپ لگا کر چھڑکاؤ کرتی ہیں۔



اس انوار کو بھی بی بی ہوا۔ میں چھت پر کھڑا نہیں دیکھ رہا تھا اور وہ اپنے کام میں منہمک تھیں۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ کبھی آرام کرتی ہوں گی۔ کبھی کبھی وہ اکیلی بیٹھی آسمان کو دیکھتی ہیں۔ بس ایک دفعہ میں نے انہیں اپنی آنکھیں صاف کرتے دیکھا ہے اپنی سفید چادر سے۔ شوہر کا انتقال تو بہت پہلے ہو گیا تھا، پانچ بیٹوں کی ماں ہیں وہ، اور وہ سب کے سب باہر متیم ہیں۔ شاید وہ بچوں ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کا کوئی بیٹا پاکستان آ رہا ہو تب ان کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ پورے محلے کو بتاتی بھرتی ہیں: وہ کینیڈا والا آ رہا ہے۔ اور پھر وہ دن بھی آ جاتا ہے جب ان کا لٹل۔ جگر پچھتا ہے کچھ دن تک رہتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ ہاں ایک دن اس تھیں کہ وہ تو آتے ہی اپنے بچوں کو گھمانے پھرانے لگتا ہے، میرا بچہ تو پھر بھی مجھے نہیں ملتا، پھر وہ واپس چلا جاتا ہے اور ماں کی اداسی اور بھی گہری ہو جاتی ہے۔ جن بیٹوں کے بیوی بچے باہر ہیں، وہ تو کئی کئی سال کے بعد آگے آتے ہیں تو ان کے پاس ایک چھوٹی سی ڈائری ضرور ہوتی ہے جس میں پہلے سے لکھا ہوتا ہے کہ پاکستان کے فلاں وقت اسے ہر حال میں اپنی بیوی بچوں کو فون ضرور کرنا ہے، بیوی بچوں کی فرمائشوں کی ایک لمبی فہرست الگ ہوتی ہے جن کی خریداری میں سارا دن بھٹکتے کے بعد جب واپس گھر لوٹتا ہے تو بوسوں کی منتظر ماں کے سامنے اپنی جھکاوٹ کا اظہار کر کے لینے کی کوئی جگہ ڈھونڈ کر بے خبر سو جاتا ہے اور ماں باہر سوئے بیٹے کو دیکھ کر خوش ہوتی رہتی ہے..... یہ ہے ان کی زندگی۔

سنا ہے کہ وہ ایک کالج کی پرنسپل رہ چکی ہیں، ساری عمر درس و تدریس میں گزار دی۔ اب بھی کئی غریب بچیوں کی کفالت انتہائی پردہ داری اور خاموشی کے ساتھ سر انجام دیتی ہیں۔ مجھے اس بات کا کبھی پتہ نہ چلتا کہ وہ کتنا اچھا لکھا اس کی اطلاع نہ دیتا، ایک دفعہ میں ان کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا تو مجھے روک کر میرے کل شام کے ٹی وی پروگرام پر تبصرہ فرمانے لگیں۔ مجھے جہاں ان کی علی

کافے کوئی جواب آپ کے پاس؟
اگر نہیں تو پھر جلدی کیجئے کہ ہمارے لئے تو ہر دن "مدرڈے" ہے۔
شجر کھیت میں جیون کی اک دکھیاری بوڑھی ماں
بویا نہیں، جو کاٹ رہی ہے

§§§
